ماہ نامہ

ہمدرد نونہال

اکتوبر ۲۰۱۹ء

مسلسل اشاعت کا ۶۷واں سال
سن آغاز ۱۹۵۳ء

ماہ نامہ ہمدرد نونہال

اکتوبر ۲۰۱۹ء
صفر المظفر ۱۴۴۱ ہجری
شمارہ نمبر ۱۰ - جلد ۶۷

صدرِ مجلس
سعدیہ راشد

مدیر اعلا
محمد سلیم مغل

معاون مدیر
سلیم فرخی

کمپوزنگ
محمد اکرم خان

۱۶ویں منزل، بحریہ ٹاؤن ٹاور، طارق روڈ،
پی ای سی ایچ ایس بلاک ۲، کراچی۔
فون: 021-38244000, 38241611 Ext. 1611
ای میل: hfp@hamdardfoundation.org
ویب سائٹ: www.hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ادارۂ سعید: www.hakimsaid.info
فیس بک پیج: /hamdardfoundationpakistan

پبلشر سعدیہ راشد نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر
ادارۂ مطبوعات ہمدرد، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا۔

نونہالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع کیا گیا۔

بہ یاد

شہید پاکستان حکیم محمد سعید
بانی سرپرست

مسعود احمد برکاتی مرحوم
مدیر اوّل

قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ پر مبنی صفحات کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔

قیمت خاص نمبر ۸۰ رُپے
قیمت عام شمارہ ۵۰ رُپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۸۰۰ رُپے
سالانہ (عام ڈاک سے) ۶۰۰ رُپے
سالانہ (دفتر سے دستی لینے پر) ۵۰۰ رُپے
سالانہ (غیر ممالک سے) ۷۰ امریکی ڈالر

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف بینک
ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابلِ قبول ہوگی۔ VPP بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

اس شمارے میں

کیا اور کہاں؟

اکتوبر ۲۰۱۹ء

۵	حمد	سلیم کوثر
۶	جاگو جگاؤ	شہید حکیم محمد سعید
۷	پہلی بات	سلیم مغل
۸	عظیم قائد	شہید حکیم محمد سعید
۹	استادوں کا دن (نظم)	ارسلان اللہ خان
۱۰	خوش خبری (اسکالرشپ)	ادارہ
۱۳	جیک ما	سلیم مغل
۱۶	زندہ پیغام	محمد اسماعیل
۲۰	روشن خیالات	ننھے گل چیں
۲۱	سام ہاؤس (۲)	جاوید بسام
۲۸	نام بوجھیے (۱۷)	سلیم فرخی
۳۳	شین شرارت	ننھے مزاح نگار
۳۹	گاؤں میں بارش (نظم)	رفیع یوسفی محرّم
۴۱	ڈائنوسارز	ڈاکٹر سیدہ صدف اکبر
۴۴	نونہال مصور	ننھے فن کار

جیک ما 13

زندہ پیغام 16

سام ہاؤس 21

۴۷	نئی منزلوں کا سفر - سفرنامہ امریکا	سلیم مغل
۵۳	پرانے کھنڈر کا بھوت	جاوید اقبال
۵۲	غلط فہمی	محمد ذوالقرنین خان
۶۱	علم دریچے	نکتہ داں نونہال
۶۵	کچی بستی	مسز سلمیٰ عقیل شاہ
۶۹	آنے والا دور	ترجمہ: رباب عائشہ
۷۳	فٹ بال سازی	نسرین شاہین
۷۶	دریا (نظم)	تنویر انجم
۷۸	نونہال خیر نامہ	سلیم فرخی
۸۰	گھوڑے کا سودا	ش ص
۸۴	ہمارا کارنامہ	علی حیدر
۹۰	معلومات افزا ۲۸۶	س ف
۹۳	جوابات معلومات افزا ۲۸۴	ادارہ
۹۴	بلاعنوان انعامی کہانی	ظلِ حنا
۱۰۰	انعامات بلاعنوان کہانی	ادارہ
۱۰۱	اردو اخبارات کی تاریخ	شکیل صدیقی
۱۰۵	نونہال ادیب	ننھے لکھنے والے
۱۱۶	اشاعت سے معذرت	ادارہ
۱۱۷	آدھی ملاقات	نونہال پڑھنے والے
۱۲۰	نونہال لغت	ادارہ

حمدِ باری تعالیٰ

سلیم کوثر

اس سے پہلے کہ یہ دنیا مجھے رُسوا کردے
تُو مرے جسم ، مری روح کو اچھا کردے

یہ جو حالت ہے مری ، میں نے بنائی ہے مگر
جیسا تُو چاہتا ہے اب مجھے ویسا کردے

مرے ہر فیصلے میں تری رضا شامل ہو
جو ترا حکم ہو ، وہ میرا ارادہ کردے

مجھ کو وہ علم سکھا جس سے اُجالے پھیلیں
مجھ کو وہ اسم پڑھا جو مجھے زندہ کردے

میرے لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال
میرے بچوں کو مہ و مہر و ستارا کردے

ضائع ہونے سے بچالے مرے معبود مجھے
یہ نہ ہو وقت مجھے کھیل تماشا کردے

میری آواز تری حمد سے لبریز رہے
بزمِ کونین میں جاری مرا نغمہ کردے

سلیم کوثر کی خوب صورت حمد سے منتخب چند اشعار

جاگو جگاؤ

نونہال دوست، شہید حکیم محمد سعید کی یاد رکھی جانے والی باتیں

ہمدردی کیا ہے؟

دوسرے کے درد کو اپنا سمجھنا اور اس میں شریک ہونا ہمدردی ہے۔ جو انسان کسی کی پریشانی، دکھ اور درد کو محسوس کرے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ غور کرے کہ اگر میں بھی اس قسم کے دکھ درد میں مبتلا ہوتا تو مجھ پر کیا بیتتی، وہ دوسرے انسان کا ہمدرد ہے اور یہ جذبہ اگر پورے طور پر پیدا ہو تو پھر وہ عمل پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ ہمدردی کا تقاضا یہی ہے۔

ہمدردی بہت بڑی خوبی اور اعلا انسانی اوصاف میں سے ہے۔ اچھے انسان کی تعریف یہی ہے کہ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھے تو اس کے دل پر اثر ہوا اور اس میں محبت اور رحم کا جذبہ پیدا ہو۔ جس انسان میں یہ جذبہ پیدا ہوگا، وہ یقیناً دکھ میں مبتلا شخص کی مدد بھی کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی تکلیف دور کرنے یا پوری طرح دور کرنے پر قادر نہ ہو، لیکن کم سے کم وہ کسی نہ کسی حد تک اس کے درد میں شریک ہوسکتا ہے، اس کا دکھ بانٹ سکتا ہے۔ وہ اسے تسلی اور دلاسے دے سکتا ہے، اپنی زبان سے اس کی ہمت بندھا سکتا ہے، کوئی اچھا مشورہ دے سکتا ہے یا پھر کوئی ایسی ترکیب بتا سکتا ہے جس سے وہ شخص اپنی مشکل خود ہی دور کر سکے۔ ہمدرد انسان کسی ایسے آدمی کا پتا بتا سکتا ہے یا خود اس کے پاس لے جا سکتا ہے جو پریشان شخص کے کام آسکے۔

قرآن حکیم نے صحابۂ کرامؓ (حضرت رسولِ اکرمؐ کے پیارے ساتھیوں) کی تعریف کرتے ہوئے سورۂ الحشر میں فرمایا ہے:

''اور یہ لوگ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ضرورمند ہوں۔'' (ترجمہ آیت ۹)

ہم خود تکلیف اُٹھا کر دوسرے کی مدد اور ہمدردی نہیں کر سکتے تو کم سے کم اپنے فائدے اور آرام میں تھوڑی سی کمی کر کے تو کسی کے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو ہم سب کی زندگی کتنی آسان اور ہماری قوم کتنی خوش حال ہو جائے۔ (ہمدرد نونہال جون ۱۹۹۰ء سے لیا گیا)

پہلی بات

سلیم مغل

۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱.....سہ پہر تین بجے کا وقت..... کمپنی باغ راولپنڈی لگ بھگ پچاس ہزار لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم بس آیا ہی چاہتے ہیں۔ ہزاروں لوگ انھیں ایک نظر دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہیں۔ شام چار بجے سے کچھ قبل ہی وزیرِ اعظم لیاقت علی خان سرکٹ ہاؤس سے کمپنی باغ تک خصوصی حفاظتی دستے کے ساتھ تشریف لاتے ہیں، جلسہ گاہ تالیوں سے گونج اُٹھتی ہے۔ تلاوتِ کلام پاک اور کچھ رسمی کارروائیوں کے بعد لیاقت علی خان کو تقریر کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم بہ مشکل تمام ابھی ''برادرانِ ملت'' کے الفاظ ہی کہہ پاتے ہیں کہ اسٹیج کے سامنے سے ایک شخص اُٹھ کر فائرنگ شروع کر دیتا ہے۔ دو گولیاں لیاقت علی خان کے سینے میں پیوست ہوتی ہیں جو جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔ پھر فوراً ہی ایک اور شخص اُٹھتا ہے اور وہ سید اکبر نامی قاتل کو مسلسل پانچ فائر کر کے ہلاک کر دیتا ہے۔ یوں قتل کے اسباب تک پہنچنے کا راستہ بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔ نئی مملکت کے پہلے وزیرِ اعظم شہادت کے مرتبے پر فائز ہو جاتے ہیں۔

۱۹۹۸ء میں اکتوبر ایک بار پھر آتا ہے۔ اس بار کراچی میں ۱۷/اکتوبر کی صبح لہو رنگ ہونے کو ہے۔ صبح ۶ بجے کا وقت ہے۔ حکیم محمد سعید اپنے گھر سے مطب جا رہے ہیں جہاں مریضوں کی بڑی تعداد ان کی منتظر ہے۔ آرام باغ کراچی میں واقع اپنے مطب پہنچ کر جوں ہی وہ اپنی کار سے باہر آتے ہیں، ان پر گولیاں برسا دی جاتی ہیں دیکھتے ہی دیکھتے حکیم محمد سعید شہادت کی سرخ قبا اوڑھ لیتے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دو عظیم قائد کس سفاکی کے ساتھ ہم سے چھین لیے جاتے ہیں، قائد بھی وہ، جو پاکستان کی محبت سے سرشار تھے اور اسے دنیا کی عظیم مملکت بنانے کے لیے روز و شب کوشاں تھے۔ اکتوبر ہر سال آتا ہے اور آ کر ہمیں دل گیر کر جاتا ہے، اکتوبر چلا جاتا ہے، مگر بہت سے سوالات اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے جن کے جواب ہمارے اکابرین اور قائدین پر آج تک قرض ہیں۔

ایک مثبت بات اگر ہے تو بس یہ اکتوبر کے مہینے میں ہم ان عظیم شخصیات کو اپنی آنکھوں میں سجا کر عہد کرتے ہیں کہ دشمن جیسا گھناؤنا کھیل چاہے کھیل لے، ہم پاکستان سے اپنی محبت اور تعلق کو کبھی کم زور نہ ہونے دیں گے۔ ضرورت پڑی تو اپنا تن من دھن سب کچھ اس دھرتی پہ قربان کر دیں گے کہ ہم نے ایثار اور قربانی کا یہی سبق شہیدِ ملت لیاقت علی خان اور شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید سے سیکھا ہے۔

خدا کرے ہمارے ان عظیم قائدین کی روحیں سرشار ہوں اور ہمارے یہ محسن بڑے درجات پائیں۔ آمین

عظیم قائد

شہید حکیم محمد سعید

صحیح فیصلہ کر کے ڈٹ جانا

جہاں تک قائداعظم کی شخصیت کا تعلق ہے مجھے سب سے زیادہ اُس کے اس پہلو نے متاثر کیا ہے کہ آدمی ایک بات کر کے اس پر ڈٹ جائے۔ قائداعظم کی پوری زندگی میں جا بہ جا یہ حقیقت بکھری ہوئی نظر آتی ہے کہ وہ ایک فیصلہ کرتے اور پھر اس پر ڈٹ جاتے۔ ان کا یہ فیصلہ بھی بالکل صحیح ہوتا اور اس پر عملدرآمد کے لیے قوت بھی وہ پوری استعمال کرتے۔ مجھے ان کی یہ چیز بہت زیادہ پسند ہے: ''صحیح فیصلہ اور پھر اس پر ڈٹ جانا'' میں اپنی زندگی میں اسی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس میں کامیابی بھی بخشی ہے۔

پانچ اکتوبر ہے

اُستادوں کا دن

ارسلان اللہ خان

بادشاہوں کا نہ شہزادوں کا دن
پانچ اکتوبر ہے اُستادوں کا دن

جو کیے تھے آپ نے اُستاد سے
آج ہی تو ہے انھی وعدوں کا دن
پانچ اکتوبر ہے اُستادوں کا دن

آ گہی سے، علم سے، حکمت سے پُر
جو بھی سیکھا تھا انہی یادوں کا دن
پانچ اکتوبر ہے اُستادوں کا دن

سیکھ کر استاد سے کرلیں عمل
رہ نہ جائے یہ محض دعووں کا دن
پانچ اکتوبر ہے اُستادوں کا دن

ارسلاںؔ! استاد ہے معمارِ قوم
اس لیے ازبر ہے ان باتوں کا دن
پانچ اکتوبر ہے اُستادوں کا دن

حکیم محمد سعید میموریل اسکالرشپ

تقسیم وظائف واسناد

حکیم محمد سعید میموریل اسکالرشپ کے لیے ہمدرد نونہال نومبر 2018ء میں اعلان کے بعد پاکستان بھر کے 26 سرکاری تعلیمی بورڈز کے ذریعے امتیازی نمبروں سے امتحان پاس کرنے والے مستحق طلبہ نے بڑی تعداد میں فارم ارسال کیے۔ جانچ پڑتال کے بعد سلیکشن کمیٹی نے 273 میٹرک پاس اور 62 انٹر پاس طلبہ کو منتخب کر کے درجِ ذیل 335 طلبہ کو وظائف دیے گئے۔

273 میٹرک پاس طلبہ کے لیے 25 ہزار روپے فی طالب علم

62 انٹر پاس طلبہ کے لیے 50 ہزار روپے فی طالب علم

14 ستمبر 2019ء کو محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ (صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان) نے کراچی بورڈ کے 149 طلبہ کو وظائف اور اسناد تقسیم کیں۔ ملک کے دیگر حصوں کے طلبہ کو لاہور، راولپنڈی اور پشاور کے ہمدرد مراکز سے وظائف تقسیم ہوں گے۔ کچھ طلبہ کو ان کے پتوں پر وظائف کے چیک اور اسناد ارسال کیے گئے۔

خوش خبری

حکیم محمد سعید میموریل اسکالرشپ بیچ نمبر 18 (2019-20)

اہلیت: طلبا و طالبات جنھوں نے گزشتہ سال پاکستان کے کسی بھی سرکاری تعلیمی بورڈ سے میٹرک اور انٹر امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہو اور کالجز کے سال اول اور یونی ورسٹیز میں زیرِ تعلیم ہوں۔

مارکس : میٹرک (2019) 85 فی صد سے زائد- انٹر 80 فی صد سے زائد نمبرز

انتخاب کا معیار : ''Merit Cum Need''

طریقہ کار :

☆ ہمدرد فاؤنڈیشن ویب سائٹ سے حکیم محمد سعید میموریل اسکالرشپ کا فارم ڈاؤن لوڈ کریں۔

☆ فارم میں درجِ ذیل ہدایات کے مطابق پُر کریں۔ کوئی کالم خالی نہ چھوڑیں۔

☆ مطلوبہ اسناد کی نقول فارم کے ساتھ منسلک کریں اور ہمدرد نونہال میں شائع ہونے والے کوپن کے ساتھ اپنی درخواست اور اسناد درجِ ذیل پتے پر 30 نومبر 2019 تک لازماً ارسال کر دیں۔

☆ نامکمل فارم قابلِ قبول نہ ہوگا۔

یا

☆ اسکالرشپ فارم کے حصول کے لیے سادے کاغذ پر درجِ ذیل کوائف کے ساتھ اپنی درخواست بھجوائیں۔

☆ 2019 میں میٹرک یا انٹر میں حاصل کردہ نمبر (مارکس شیٹ)

☆ افراد خانہ/ والد یا سرپرست کی ماہانہ آمدنی؟

☆ ڈاک کا پتا، رابطے کا فون نمبر۔

☆ ہمدرد نونہال میں شائع ہونے والا اسکالرشپ کوپن۔

☆ درخواست بھجوانے کی آخری تاریخ 30 اکتوبر 2019 ہے۔

دفتر: ڈائریکٹر ایچ آر اینڈ ایڈمن، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، 16 فلور، بحریہ ٹاؤن ٹاور، طارق روڈ، کراچی۔ فون نمبر 021-38244000

کوپن برائے حکیم محمد سعید میموریل اسکالرشپ

نام : .....

پتا : .....

حاصل کردہ مارکس اور پرسنٹیج : ☐ میٹرک ..... ☐ ..... انٹر .....

بورڈ کا نام : .....

کالج/ یونی ورسٹی : ..... کلاس : .....

☆ کوپن سادہ کاغذ کے درمیان میں چپکائیں۔ ☆ ایک کوپن ایک طالب علم کے لیے ہے۔ ☆ مقررہ تاریخ کے بعد کوپن قابلِ قبول نہ ہوگا۔

Press ad

Page 12

Editor's
Facebook
Page

جیک ما

جیتا جاگتا معاشی جادوگر

چین کے شہر ہنگ زُو کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ آئندہ چند سالوں میں تجارت کی دنیا میں کیسی قیامتیں ڈھانے والا ہے کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ دُھن کا پکا، من کا سچا اور انگریزی کے جنون میں مبتلا ''جیک ما'' نامی یہ لڑکا جس طرح کامیابیوں کی منزلیں طے کرتا ہوا دنیا کا طاقت ور ترین شخص بن جاتا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور جدوجہد کرنے والوں کے لیے قابلِ مطالعہ بھی۔ ایسا نہیں کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہو یا قسمت کی دیوی شروع ہی سے اُس پر مہربان رہی ہو۔ اُس کا بچپن سخت جدوجہد اور مسلسل ناکامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنی پہلی ملازمت کے لیے جب اُس نے دیگر ۲۳ اُمیدواروں کے ساتھ کے ایف سی میں درخواست جمع کروائی تو بقیہ ۲۳ کو تو ملازمت پر لے لیا گیا مگر جیک ما کو چلتا کیا۔ اُن کی دانست میں یہ نالائق تھا۔ ایسا ہی کچھ سلوک میکڈونلڈ والوں نے بھی کیا۔ جہاں جاتا دھتکار دیا جاتا، معذرت کی جاتی....

تو کیا وہ مایوس ہو کر گھر بیٹھ گیا؟....نہیں ہرگز نہیں....شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۰ ستمبر ۲۰۱۹ کو ۵۵ سال کی عمر میں جب یہ پُتلی آنکھوں اور چپٹے چہرے والا، دھان پان سا بندہ خود اپنی ہی کمپنی سے ریٹائر ہوا تو اس کے ذاتی اثاثوں کی مالیت 35.6 بلین ڈالر تھی۔ اب ذرا اس رقم کو اپنے رُپے میں ترجمہ کر کے تو دیکھیے، یہ رقم ساڑھے پانچ کھرب روپے سے زیادہ بنتی ہے۔ دنیا کے چند امیر ترین اور اہم ترین لوگوں میں شمار کیا جانے والا، چین کی کمیونسٹ پارٹی کا رکن، دنیا بھر میں چینی مصنوعات اور تجارت کا سفیر، سیاست دان، فلن تھراپسٹ، سرمایہ کار اور دنیا کی سب سے بڑی تجارتی ویب سائٹ ''علی بابا'' کا مالک۔ مسلسل ناکامیوں کے بعد کیا اتنی بڑی کامیابی بھی حاصل کی جاسکتی ہے!! ''جیک ما'' نے دنیا بھر کے لوگوں کو حیران کر دیا۔

ہمارے قارئین ضرور جانتے ہوں گے کہ جو لوگ ملازمت پر ذاتی کام کو ترجیح دیتے ہیں اور جو لوگ اپنی آنکھوں میں بڑے خواب سجا کر بہت کم وسائل سے چھوٹا سا کام شروع کر دینے میں ہچکچاتے نہیں، تو اس نوعیت کے نئے اداروں کو ''اسٹارٹ اپ'' کہا جاتا ہے۔ دنیا میں ایسی بہت سے مثالیں ہیں کہ کسی نے معمولی رقم سے تجارت کا آغاز کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تجارت کو کامیابیوں کے بلندی پر پہنچا دیا، مگر جیک ما جیسی بلندی تو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جیک ما نے جس ادارے کو محض ۱۸ کارکنان کے ساتھ مل کر ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے شروع کیا تھا وہ ادارہ ۳۰ ہزار کارکنان تک جا پہنچا۔ ''جیک ما'' کہتا ہے میں نے ۱۴ ملین ملازمتیں پیدا کیں۔ گویا وہ ۱۰ ملین سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کا ذریعہ بن گیا۔ کیا کہنے!

میرے بس میں ہو تو میں نئے تجارتی اداروں کی پیشانی پر ''جیک ما'' کی تصویریں لگا دوں اور درس گاہوں سے نکل کر روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے نوجوانوں سے کہوں کہ، اس شخص کو غور سے دیکھو، محنت کے لیے اس کی کامیابیوں سے تحریک لو، بڑے ویژن کے لیے اس کی پُتلی سی آنکھوں میں جھانکو اور اپنے آپ کو سمجھاؤ کہ اگر آہنی عزم اور دور بین نگاہیں

کہیں سے مل جائیں تو اتنی بڑی کام یابی ممکن ہوسکتی ہے۔

جیک ما کی کہانی بھی خوب ہے، بچپن میں پڑھنے لکھنے کا ایسا کوئی خاص شوق نہ تھا، مگر ہاں انگریزی سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ہنگ زُو کے انٹرنیشنل ہوٹل میں کسی غیر ملکی کو دیکھ لیتا تو فوراً بے تکلف ہو جاتا اور انگریزی میں بات چیت کی کوشش کرتا، پھر اسے اپنا ایڈریس دیتا اور یوں قلمی دوستی کا آغاز کر دیتا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہر روز اپنی سائیکل پر ۷۰ میل کا سفر کرتا اور سیاحوں کے ایک بڑے مرکز پہنچ کر ان سے انگریزی میں باتیں کیا کرتا۔ ایک انگریز سیاح نے اس کا نام ''جیک'' رکھ دیا۔ واضح رہے کہ ''جیک'' اس کا پیدائشی نام نہ تھا۔ جیک مانے، جیسے تیسے ۱۹۸۸ء میں انگلش میں بی اے کرلیا اور پھر کچھ عرصے کے لیے انگریزی کی تدریس سے وابستہ ہوگیا۔ ہارورڈ بزنس اسکول میں دس مرتبہ داخلے کی کوشش کی، خیر سے ہر بار ناکام ہوا۔ سچ یہ ہے کہ کام یابی تو کہیں اور اس کی منتظر تھی۔ بل آخر اس نے چند کارکنان کے ساتھ مل کر ایک اپارٹمنٹ میں چھوٹی سی کمپنی قائم کی۔ آگے چل کر یہی کمپنی ''علی بابا'' کے نام سے دنیا میں شہرت پانے لگی۔ آج دنیا میں کوئی ایسا تجارتی ادارہ نہیں جو علی بابا پہ رجسٹر ہوئے بغیر کام یابی سے اپنی تجارت کو فروغ دے سکے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ۱۰۰ ملین سے زیادہ لوگ ہر روز علی بابا کی ویب سائٹ کا وزٹ کرتے ہیں اور براہِ راست یا بالواسطہ اربوں کھربوں کی خریداری کرتے ہیں۔

گزشتہ ۱۰ ستمبر کو جب ہمارے ٹی وی چینلز پر ماہرین معاشیات اور تجزیہ نگار ہماری معاشی زبوں حالی کے اسباب پر بحث کر رہے تھے، عین اسی روز دنیا بھر کے ٹی وی چینلز ''جیک ما'' کو دنیا کا کام یاب ترین انسان ثابت کرنے پہ اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ اس روز ''جیک ما'' نے اپنی ۵۵ ویں سال گرہ کا کیک کاٹا اور اعلان کیا کہ ''میں خود اپنی ہی کمپنی سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کرتا ہوں، میری بقیہ زندگی تعلیم کے میدان میں کام کرتے ہوئے گزرے گی۔''

تعلیم جو قوموں کی کامیابی کی بنیاد ہے۔

زندہ پیغام

محمد اسماعیل عبدالعزیز

مجھے یاد ہے ۱۹۸۷ء میں ''آوازِ اخلاق'' میں حکیم محمد سعید صاحب کی ڈائری شائع کی گئی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ صبح چار بجے سے رات بارہ بجے تک مسلسل کام کرتے ہیں۔ اکثر روزے بھی رکھتے ہیں۔ غذا کی نہایت معمولی مقدار لیتے ہیں اور کمال یہ ہے ۶۷ سال کی عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ چست اور چاق چوبند رہتے ہیں۔

ہمدرد نونہال میں نے چھے سال کی عمر میں ۱۹۷۷ء سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت تو مجھے کہانیوں سے ہی دل چسپی تھی، مگر ایک دو سال بعد میں مکمل رسالے کا مطالعہ کرنے کا شوقین ہو گیا۔ حکیم صاحب کا کالم ''جاگو جگاؤ'' پڑھ کر ان سے ملاقات کا شوق بھی دل میں مچلنے لگا۔ ایک بار بیمار ہوا تو والدہ نے حکیم صاحب کے پاس چلنے کو کہا۔ میری نو دس سال کی عمر تھی۔ خیال تھا کہ عام معالجوں کی طرح حکیم صاحب کا کوئی چھوٹا سا مطب ہوگا، جہاں چند منٹ بعد باری آ جائے گی۔ والدہ کے ساتھ ہمدرد دواخانے پہنچا تو وہاں عالم ہی کچھ اور تھا۔ اتنی بڑی عمارت، اتنے سارے مریض۔ معلوم ہوا حکیم صاحب کے معائنہ کرنے کے مخصوص دن ہوتے ہیں اور پہلے سے نمبر لینا پڑتا ہے۔ اس روز حکیم صاحب کی جگہ دوسرے معالج موجود تھے۔ انھوں نے مجھے اچھی طرح دیکھ بھال کر بڑی اچھی دوا لکھ دی۔ میں لوٹ آیا، مگر ہمدرد دواخانے کا نقشہ ذہن میں خوب بیٹھ گیا۔

ایک بار میں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ جن کے والد ہمدرد دواخانے میں کام کرتے تھے، معائنے کے لیے نمبر لیا۔ بیمار تو پڑتا ہی رہتا تھا، مگر اس موقع پر علاج صرف بہانہ تھا۔ اصل میں تو میں ان گلابی ہونٹوں کو دیکھنا چاہتا تھا، جو برسوں سے مجھے پیغامِ حیات دے رہے تھے۔ ان پیارے ہاتھوں کو تکنا چاہتا تھا، جن میں پکڑا ہوا قلم اخلاق اور تعمیر کی اَن مٹ داستان لکھ رہا تھا۔

صبح سویرے میں ہمدرد دواخانے پہنچ گیا۔ مریضوں کا زبردست ہجوم تھا۔ پہلی منزل پر ایک کشادہ برآمدے میں تھوڑی دیر انتظار کے بعد میرا نمبر آ گیا۔ بڑے لوگوں سے ملتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی ہے، مگر اس روز حکیم صاحب کے پاس جاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بیٹا اپنے باپ کے پاس جا رہا ہے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہی محبت و شفقت اور سکون کی ایک چادر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میرا خیال ہے یہ تجربہ صرف مجھے ہی نہیں، حکیم صاحب کے پاس جانے والے اکثر مریضوں کو ہوتا ہوگا کہ حکیم صاحب کی

عظمت کے باوجود ان کے سامنے گھبراہٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بلاشبہ یہ حکیم صاحب کی مریضوں سے قلبی شفقت اور دلی محبت کا اثر تھا کہ مریض بھی انھیں اپنا سمجھتے تھے اور ان کے پاس بے کھٹکے جاتے تھے۔

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی میں نے سفید شیروانی میں ملبوس اس باوقار عظیم انسان کو اپنے سامنے پایا۔ مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتے ہوں۔ میں نے سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پہلے نام دریافت کیا، پھر پوچھا: ''کیا کرتے ہیں؟''

میں نے بتایا: ''قرآن مجید حفظ کر رہا ہوں۔''

یہ سن کر وہ بڑے خوش ہوئے۔ واقعی، علم و عالم کی ناقدری کے اس دور میں حکیم صاحب وہ نایاب انسان تھے جو علم کی قدر کرتے تھے اور عالموں کی عزت کرنا جانتے تھے۔

پھر انھوں میری نبض ٹٹولی۔ ان کی ملائم، مگر مضبوط اُنگلیوں کا لمس میں اپنی کلائی پر محسوس کرتا رہا۔ مجھے مسلسل معدے کی کم زوری کی شکایت تھی۔ میں نے کہا: ''عام کھانے سے بھی بدہضمی ہو جاتی ہے۔'' عام کھانے سے میری مراد تین وقت کا کھانا تھا۔

حکیم صاحب معنی خیز انداز میں مسکرائے اور مزاق میں میرے ''عام کھانے'' کو ''آم کھانے'' کا جامہ پہناتے ہوئے بولے: ''نہیں بھئی نہیں، آم کھانے سے بدہضمی ہونا اچھی بات نہیں۔ آم تو جنتی پھل ہے۔ آپ کے معدے کا نظام ضرور درست ہونا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ نسخہ لکھوانے لگے۔ حکیم صاحب بول رہے تھے اور ان کے ایک معاون تیزی سے لکھ رہے تھے۔ جاتے ہوئے میں نے حکیم صاحب سے ہاتھ ملایا۔ انھوں نے بڑی شفقت سے مجھے رخصت کیا۔

وقت گزرتا رہا۔ حکیم صاحب کے کارہائے نمایاں بڑھتے رہے۔ انھوں نے ''مدینۃ الحکمت'' کا

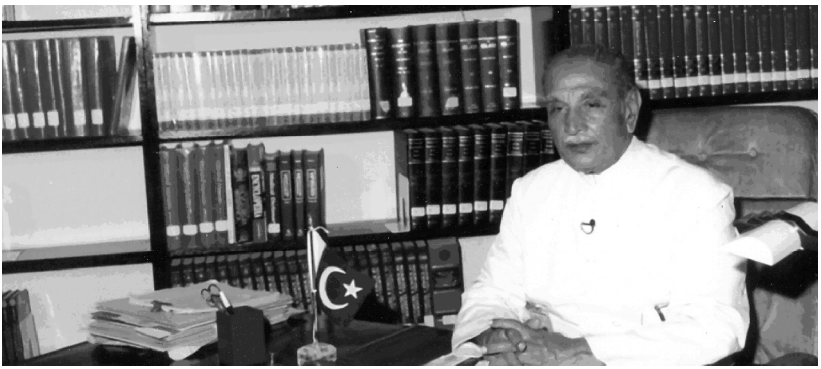

سنگ بنیاد رکھا، پھر ہمدرد یونی ورسٹی اور ہمدرد پبلک اسکول کے ساتھ ''بیت الحکمہ'' بھی تعمیر کر دیا۔ حکیم صاحب کی اعلا خدمات پر میری طرح ہر پاکستانی کو فخر ہے۔ سب کی خواہش اور تمنا تھی کہ وہ ہزاروں سال جئیں۔ ان کے تمام ارادے، تمام منصوبے پایۂ تکمیل کو پہنچیں، مگر ایک دن..... جب وہ روزے کی حالت میں صبح سویرے اپنے مطب کے دروازے پر اللہ کے بندوں کے دکھ درد دور کرنے پہنچے تو کچھ درندہ صفت انسانوں نے انھیں اپنی سفاکی کا نشانہ بنا ڈالا۔ آہ! اس چشمے کو خشک کر دیا جو کسی تفریق کے بغیر محبت کے امرت سے انسانیت کو سیراب کر رہا تھا۔ اس سینے کو چھید ڈالا جس میں علم کے نایاب خزانے چھپے ہوئے تھے۔ ان ہونٹوں کو خاموش کر دیا جو زمانے بھر کو یہ پیغام دے رہے تھے: ''جاگو جگاؤ پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو۔''

حکیم محمد سعید، شہید ہو کر زندہ جاوید ہیں، ان کا پیغام زندہ ہے۔ ان کا کام زندہ ہے۔ ان کی تحریریں آج بھی اتنی ہی پراثر ہیں، اس لیے کہ انھیں پڑھتے ہوئے ہم کبھی یہ نہیں بھلا سکے کہ یہ اس شخص کی تحریر ہے جس نے اپنے مشن کی خاطر جان قربان کر دی۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے ہر حرف میں قلم کی روشنائی کے ساتھ خون کی سرخی بھی شامل ہے۔

روشن خیال

تجربے اور دانائی کا حاصل، علم و حکمت کی باتیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

دانا وہ ہے، جو اپنی بُری خواہشوں کو لگام دے۔

رملہ شیخ، حیدر آباد

حضرت علی کرم اللہ وجہ

ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق بات کیا کرو۔

ماہ رخ طاہر، گلشن اقبال

بابا فرید گنج شکرؒ

انسان کی جان کی دشمن اس کی زبان ہے۔ جان کی سلامتی درکار ہے تو زبان کی حفاظت کرو۔

عبداللہ مومن قائم خانی، ٹنڈو الہیار

شیخ سعدیؒ

جو شخص بے سوچے سمجھے جواب دیتا ہے، اس کی اکثر باتیں غلط ہوتی ہیں۔

عبدالستار آفریدی، منگھوپیر

جبران خلیل جبران

لوگ مذہب کی خاطر جان تو دے سکتے ہیں، مگر مذہب پر عمل نہیں کر سکتے۔

محمد علیم نظامی، لاہور

بقراط

نصیحت وہ چیز ہے جسے بے وقوف مانتا نہیں اور عقل مند کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

عمارہ خرم، کراچی

گلیلیو

دنیا کا کوئی شخص بے کار نہیں، ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ **امبر شبیر، صادق آباد**

کنفیوشس

اپنی لمحے بھر کی خوشی کی خاطر دوسروں کی عمر بھر کی خوشیاں مت چھینو۔ **کومل فاطمہ اللہ بخش، لیاری**

ایمرسن

خون کی ندیاں بہا دینے سے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی، جو صرف ایک آنسو پونچھ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

تحریم خان، شمالی کراچی

ابراہام لنکن

سفارش ایک معاشرتی روگ ہے۔

ایمن شیخ، لیاری

دوسری اور آخری قسط

سام ہاؤس

جاوید بسام

پہلی قسط کا خلاصہ

بلاقی کو چوان قریبی قصبے میں سامان پہنچانے جارہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے اشارہ کیا۔ بلاقی نے اسے تھوڑی دور جا کر اُتار دیا۔ گودام پہنچ کر بلاقی کو اس آدمی کا اٹیچی کیس نظر آیا۔ وہ اٹیچی لے کر اسے ڈھونڈنے نکلا۔ وہ ایک ہوٹل میں تھا کہ اٹیچی کیس چوری ہوگیا۔ بلاقی اس آدمی کے گھر پہنچا۔ وہ آدمی پروفیسر سام تھا۔ اس کے گھر کا نام سام ہاؤس تھا۔ پروفیسر نے بلاقی کو بتایا کہ آج کل یہاں ایک روح آتی ہے۔ اصل میں، میں نے ایک مقدمے میں گواہی دی تھی اور مجرم کو پھانسی ہوگئی تھی۔ جلاد نے بتایا تھا، مجرم نے پھانسی سے پہلے کہا تھا کہ میں پروفیسر کو نہیں چھوڑوں گا۔ بلاقی رات کو وہیں رہ گیا۔ وہاں اسے ایک سایہ نظر آیا۔ بلاقی نے ملازم کا کمرا دیکھا تو وہ خالی تھا۔ اس نے پروفیسر سے پوچھا کہ پال کہاں گیا؟

پروفیسر نے کہا: ''وہ احاطے میں نہ چلا گیا ہو!''

بلاقی نے سر ہلایا۔ دونوں مکان سے باہر نکلے تو انھوں نے وہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔ آسمان پر زرد چاند چمک رہا تھا۔ اونچے اونچے گھنے درخت، بھوتوں کی طرح سر اُٹھائے کھڑے تھے اور پال ایک درخت کے تنے سے چمٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سر زور زور سے ہل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا، وہ کچھ پڑھ رہا ہے۔

پروفیسر نے سرگوشی کی: ''میں نے پہلے بھی اسے ایسی حالت میں دیکھا ہے۔''

دونوں کچھ دیر تک وہاں کھڑے رہے، پھر خاموشی سے اندر آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد آوازیں آہستہ آہستہ دھیمی ہونے لگیں، پھر اچانک بند ہوگئیں۔ ہر طرف پُراسرار سکوت چھا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوا چلنی بھی بند ہوگئی ہے۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، یہاں تک کہ جھینگروں کی سیٹیاں اور پنکھے کی چوں چوں بھی بند ہوگئی تھی۔

بلاقی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، پھر وہ بولا: ''یہ سب بہت حیرت انگیز ہے۔''

پروفیسر نے پوچھا: کیا یہ تمھیں انسانی کارروائی لگتی ہے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیا آپ نے مکان کا جائزہ لیا ہے؟''

''ہاں، کئی بار۔''

''میں ان چیزوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' پروفیسر نے پریشانی سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، آپ فی الحال یہ گھر چھوڑ دیں۔''

پروفیسر صاحب سوچتے ہوئے گردن ہلانے لگے۔ پھر دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بلاقی کو

نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ تمام واقعات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھا اور دبے پاؤں راہداری میں نکل آیا۔ اس کی تیز نظریں دیواروں کا جائزہ لے رہی تھیں، مگر سپاٹ دیواروں پر کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ پال کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

صبح پروفیسر نے بلاقی سے کہا: ''میں نے سوچا ہے، کچھ دن کے لیے اپنے بھائی کے گھر چلا جاؤں۔''

بلاقی نے کہا: ''اچھی بات ہے۔''

پروفیسر نے بلاقی کو کچھ رقم دینے کی کوشش کی، مگر اس نے انکار کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ سوچ میں گم تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا۔ وہ اس راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے بگھی گھمالی۔ وہ ایک بار پھر سام ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

دو دن بعد بلاقی پھر ہل ٹاؤن پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ اس نے بگھی پہاڑ کے قریب روکی اور اوپر چڑھنے لگا۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا، بلاقی احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ اوپر پہنچا تو سام ہاؤس اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ صرف ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ بلاقی رک کر سانس درست کرنے لگا۔ اس کی نظریں گھر پر جمی تھیں۔ اچانک اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک پہاڑی کے پیچھے سے تین آدمی نکلتے نظر آئے۔ ان کے سروں پر ایک ایک پیٹی رکھی تھی۔ بلاقی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ سام ہاؤس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر فضا میں اُلّو کی تیز آواز گونجی اور فوراً دروازہ کھل گیا۔ تینوں اندر چلے گئے۔ بلاقی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاوی اور دبے قدموں اس طرف بڑھا۔ روشن کھڑکی کے نیچے پہنچ کر اس نے سن گن لینے کی کوشش کی، مگر کوئی آواز نہ آئی۔ پھر اس کی نظر پائپ پر پڑی۔ اس نے آستینیں چڑھائیں اور اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ چھت پر پہنچ گیا۔ زینے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بغیر آواز پیدا کیے نیچے اُترا۔

ایک کمرے میں سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلاقی دیوار کے ساتھ چپک کر سننے لگا۔ کوئی کہہ رہا تھا: ''یہ اچھا ہوا، پروفیسر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اب ہم اپنا کام آسانی سے کر سکیں گے۔''

پھر کچھ کھسکانے کی آواز آئی۔ بلاقی نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ پال فرش پر سے قالین ہٹا رہا تھا۔ بلاقی کو تہ خانے کا راستہ نظر آیا۔ ایک آدمی پیٹی اُٹھا کر نیچے اُتر گیا۔ جب تینوں پیٹیاں نیچے پہنچ گئیں تو انھوں نے راستہ بند کر دیا۔ ایک آدمی جوان کا سرغنہ لگتا تھا، بولا: ''کتنی پیٹیاں ہوگئیں؟''

''تیں۔'' اندر جانے والے نے جواب دیا۔

''چلو، ٹھیک ہے۔ ہمیں اب تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ پال ہمارے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔''

پال نے سر ہلایا۔ بلاقی دبے قدموں اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جس میں اسے بند کیا گیا تھا۔ اس میں بجلی نہیں تھی۔

اسی دوران باہر سے ایسی آواز آنے لگی، جیسے کسی نے منھ میں کپڑا ٹھونس دیا ہے۔

بلاقی نے چپکے سے باہر جھانکا۔ پال فرش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

سرغنہ بولا: ''یہ شاید زمین پر بنے نشانوں کی طرف ہماری توجہ دلا رہا ہے۔''

پال زور سے ہاں ہاں میں سر ہلانے لگا۔

سرغنہ چلّایا: ''اوہ..... اس کا مطلب ہے، یہاں کوئی آیا ہے۔''

''ڈھونڈو..... پورے گھر کی تلاشی لو۔ تم اوپر جاؤ۔ تم احاطے میں دیکھو۔''

تو تا بھی شور سن کر بولنے لگا تھا۔

وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ اندھیرے کمرے کی طرف بڑھے تو تو تا بولا: ''کتنی پیٹیاں ہوگئیں..... کتنی.....''

''میں کسی دن اس کی گردن مروڑ دوں گا۔'' سرغنہ غصے سے بولا۔

بلاقی کمرے کے ایک اندھیرے گوشے میں چھپا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

پھر دونوں کمرے میں چلے آئے۔ سرغنے کے ہاتھ میں پستول تھا، وہ بولا: ''بتی جلاؤ۔''

پال نے اشاروں میں سمجھایا کہ اس کمرے میں بتی نہیں ہے۔

''جلدی ٹارچ لاؤ۔''

پال ٹارچ لے آیا۔ بلاقی سوچ رہا تھا، آج تو بُرے پھنسے۔

بلاقی پر تیز روشنی پڑی۔

سرغنہ چلّایا: ''کون ہو تم؟''

''میں..... میں بلاقی ہوں۔ پروفیسر سے ملنے آیا تھا۔'' بلاقی ہکلا کر بولا۔ وہ خوف زدہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

تینوں غصے سے بلاقی کو گھور رہے تھے۔

''اب اس کا کیا کریں؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

سرغنہ بولا: ''اسے یہیں بند کر دو۔ بعد میں سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔''

وہ باہر نکلے اور دروازہ بند کر دیا۔

بلاقی چلّایا: ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے چھوڑ دو۔''

ساری رات بلاقی کمرے میں بند رہا۔ دروازہ بہت مضبوط تھا اور کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ صبح پال ناشتا لے کر آیا۔ ایک آدمی پستول سنبھالے اس کے ساتھ تھا۔

بلاقی بولا: ''پال! میں پروفیسر کا مہمان ہوں۔ مجھے کیوں بند کر دیا ہے؟''

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کچھ لوگ باہر چلے

گئے۔ بلاقی کان لگائے کھڑا تھا۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف کچن سے برتن دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بلاقی سوچ میں ڈوبا تھا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ چلّایا: ''پال! خدارا دروازہ کھولو۔ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔''

راہداری میں قدموں کی آواز آئی۔

''ہائے ہائے ..... میں کیا کروں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔'' بلاقی چلّائے جا رہا تھا۔ پھر وہ زور سے کراہا اور زمین پر گر گیا۔ اس کے منھ سے آہیں نکل رہی تھیں۔ پال تیزی سے دروازے تک آیا۔ بلاقی نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور خاموش ہو گیا۔

آخر دروازہ کھلا اور پال نے اندر جھانکا۔ بلاقی بے سدھ پڑا تھا۔ وہ اندر آ کر بلاقی پر جھکا۔ بلاقی پہلے سے تیار تھا، اس نے لیٹے لیٹے ٹانگ چلائی، پال نیچے گر گیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پھر دو چار زوردار ہاتھ جمائے اور تیزی سے اُٹھ کر باہر نکلا اور دروازہ بند کر دیا۔

''واہ وا.....شاباش۔'' تو تا بولا۔

بلاقی مسکراتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

بلاقی جب پولیس کے ساتھ وہاں آیا، اسی وقت وہ تینوں بھی واپس پہنچے۔ پولیس کو دیکھ کر انھوں بھاگنے کی کوشش کی، مگر پکڑے گئے۔ کچھ دیر بعد سب تھانے میں بیٹھے تھے۔ پروفیسر سام کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ جلد ہی تینوں نے اپنا جرم قبول کر لیا۔

ان کا کہنا تھا: ''ہم اسمگلنگ کا کام کرتے ہیں، قریبی سرحد سے اسلحہ اسمگل کرتے اور یہاں جمع کر کے پھر آگے لے جاتے ہیں۔ ہم نے پال کو رقم کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔''

''تم نے وہ آلات گھر میں کب لگائے؟'' پروفیسر صاحب نے پوچھا۔

''کیسے آلات؟''

''جن سے آوازیں اور چیخیں سنائی دیتی تھیں۔''

''ہم نے کوئی آلات نہیں لگائے۔ ہم تو خاموشی سے اپنا کام کرتے تھے۔''

سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''تمھارا مطلب ہے، تم نے روح کا ناٹک نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''تم نے کبھی وہاں روح کو محسوس کیا؟''

''ہاں کئی بار، لیکن ہمارا خیال تھا کہ آپ کو ان چیزوں سے دل چسپی ہے۔ آپ نے خود ہی لوگوں کو گھر سے دور رکھنے کے لیے یہ ناٹک کر رکھا ہے۔''

سب سوچ میں پڑ گئے۔

پھر پولیس کے ماہرین کی ایک ٹیم دو دن تک گھر کا جائزہ لیتی رہی، مگر انھیں کوئی آلات نہیں ملے۔ اسی دوران بلاقی، پروفیسر کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ وہ تجسس کا شکار تھا اور اس راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا۔ آخر ماہرین کی ٹیم نے فیصلہ دیا کہ گھر میں کسی بھی قسم کے آلات نہیں ہیں۔ تب بلاقی کو یقین آیا کہ واقعی کسی آسیب نے گھر پر قبضہ جما لیا ہے، ورنہ پہلے وہ اسے مجرموں کی کارستانی سمجھ رہا تھا۔

اسی دن پروفیسر سام اور بلاقی نے گھر چھوڑ دیا۔ پروفیسر اپنے بھائی کے گھر چلے گئے اور بلاقی اپنے قصبے کی طرف چل دیا۔ کچھ دنوں بعد بلاقی کو پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے ایک خط اور کچھ رقم موصول ہوئی۔ خط میں اس کی خدمات کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور رقم بطور انعام کے تھی۔ بلاقی کندھے اُچکا کر رہ گیا تھا۔

سام ہاؤس جو عجیب و غریب واقعات کی وجہ سے اب ویران ہے۔ اس واقعے کے دو سال بعد پروفیسر سام اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

آپ کا درست جواب آپ کی ذہانت اور علم وآگہی پر مہر تصدیق ہوگا

نام بوجھیے

سلیم فرخی

میرا تعلق میمن برادری کے باوانی خاندان سے ہے۔ میں کاٹھیاواڑ کے علاقے جیت پور میں ۳۰؍جون ۱۸۸۰ء (بروز بدھ) پیدا ہوا۔ میرے دادا بیگ محمد ولی محمد تیل کے کام میں کمیشن ایجنٹ تھے۔ ان کے چھے بیٹے تھے۔ ان میں حاجی داؤد میرے والد تھے۔ میری والدہ کا نام حنیفہ بائی تھا، جو بڑی نیک دل خاتون تھیں۔ میری زندگی اور کردار پر میری ماں کے اثرات نمایاں تھے۔ ہماری برادری میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور تجارت ہمارا روایتی پیشہ ہے۔ میرے والد

نے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔اس زمانے میں ساتویں جماعت میٹرک کے برابر تھی اور تعلیم کا معیار انٹر سے بھی زیادہ بلند تھا۔ میں نے بھی چند جماعتیں پرائیوٹ اسکول سے پڑھیں اور کچھ انگریزی سیکھی۔

۱۸۹۱ء میں میرے والد برما جا کر چاول کے کام سے منسلک ہو گئے۔۱۸۹۵ء میں جب میری عمر صرف پندرہ برس تھی، انھوں نے مجھے برما بلوالیا اور صالح محمد غازیانی کی فرم میں ۲۵ روپے ماہوار پر ملازم رکھوادیا۔ وہاں میں نے محنت، سلیقے اور دیانت داری سے کام کیا۔فرم میری کارکردگی سے بہت متاثر ہوئی۔ مجھے صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ میں ہر روز کپڑے بدلتا اور انھیں دھوتا بھی خود ہی تھا۔تین سال بعد مجھے شادی کے سلسلے میں گھر (جیت پور) بلوالیا گیا۔فرم نے میری خدمات سے خوش ہو کر سونے کے تار سے کڑھی ہوئی ٹوپی دی تھی۔۱۸۹۸ء میں عثمان عبدالشکور چھوٹانی کی بیٹی مریم بائی سے شادی ہوئی۔ میرے تین بیٹے عبدالواحد، زکریا اور گل محمد اور پانچ بیٹیاں فاطمہ، رابعہ، حوا، ہاجرہ اور زبیدہ بائی پیدا ہوئیں۔

شادی کے بعد ملازمت چھوڑ کر برما میں والد صاحب کے ساتھ کام میں شریک ہو گیا۔کچھ عرصے بعد اپنا ایک کام شروع کر دیا۔رنگون کی مغل اسٹریٹ کے کونے پر ایک چھوٹی سی دوکان سے کام کی ابتدا کی۔ میں سائیکل پر باردانہ (خالی بوریاں) جمع کر کے شہر میں بیچتا تھا۔رفتہ رفتہ کام بڑھتا گیا۔۱۸۹۹ء میں ایک فرانسسی فرم کو ۲۵ گانٹھیں فراہم کیں۔اب چھوٹی سی دوکان کے بجائے یہاں بڑی جگہ لے کر ایک فرم قائم کی۔۱۹۰۱ء میں جب والد صاحب حج کے لیے گئے تو میں نے ان کا کام بھی سنبھالا اور اس خوش اسلوبی سے کام کیا کہ جب والد حج سے لوٹے تو میں نے انھیں دو لاکھ کی رقم پیش کی۔والد صاحب بہت خوش ہوئے۔

۱۹۱۲ء میں میں نے اپنے بھائی عبدالستار کے ساتھ مل کر رنگون میں ایک نئی کمپنی قائم کی۔ یہاں باردانے کے ساتھ سوٹ، سیمنٹ اور ماچس کا کاروبار شروع کر دیا۔۱۹۱۴ء میں ایک اور کمپنی کلکتہ

میں قائم کی۔اس کمپنی نے بھی خوب ترقی کی۔ ۱۹۱۸ء میں اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں جیت پور پہنچا۔ ۱۹۱۹ء میں والدہ کا انتقال ہوا۔

۱۸۹۹ء سے جس کاروبار کی ابتدا کی تھی، ۱۹۲۰ء تک اسی میں اتنی ترقی ہوئی کہ میں اس زمانے میں کروڑ پتی بن گیا۔ اسی زمانے میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں طبیہ کالج کے قیام کے لیے فنڈ جمع کر رہے تھے، وہ میرے پاس بھی تشریف لائے۔ میں نے حسبِ ضرورت ان کی مدد کی۔ اس کے علاوہ برمایونی ورسٹی کی توسیع کے لیے بھی خطیر رقم پیش کی۔

۱۹۲۴ء میں والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے جیت پور میں ایک ڈسپنسری قائم کی تھی اور ان کی خواہش تھی کہ اسے ایک بڑے اسپتال کی شکل دی جائے۔ ۱۹۲۶ء میں میں نے ان کی یہ خواہش پوری کردی، جب میں اپنے بیٹے عبدالواحد کی شادی کے سلسلے میں وہاں گیا تھا۔ آج بھی یہ اسپتال کاٹھیاواڑ کے عمدہ اسپتالوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء کو رنگون سے کلکتہ آ گیا۔ مارکیٹ کا جائزہ لیا اور ۴/دسمبر ۱۹۲۷ء کو ۸۰ لاکھ روپے کے سرمائے سے جوٹ مل قائم کی۔ جوٹ کی صنعت میں، میں پہلا مسلمان تھا۔

۱۹۲۹ء میں انگریز حکومت نے تاجروں پر کوئی ٹیکس لگایا تو تاجر تنظیموں نے مجھ سے رجوع کیا۔ میں تاجروں کا ایک وفد لے کر قائداعظم کے پاس پہنچا تاکہ وہ کوئی قانونی مشورہ دیں۔ یہ میری قائداعظم سے پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں قائداعظم سے مرتے دم تک قربت رہی۔

۱۰/اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ''آل انڈیا میمن کانفرنس'' کی صدارت کی۔ ۲۹/مئی ۱۹۳۳ء کو میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد برادری میں تعلیم عام کرنا، معاشی ترقی کا فروغ، غیرضروری رسومات کا خاتمہ، غریب طلبہ کی مالی امداد اور غریب طبقے کی آبادکاری تھا۔ غریب طلبہ کو پورے سال کے وظیفے کے علاوہ ان کے والدین کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ہر ہفتے میٹنگ ہوتی تھی اور مسائل کا حل نکالا جاتا تھا۔ میں ہر مہینے پابندی سے امدادی رقم بھیج دیا

کرتا تھا۔ وظیفے اور امداد کی نگرانی میں خود کیا کرتا تھا۔ اس طرح میں نے قوم میں تعلیم کا زبردست انقلات برپا کر دیا تھا۔

۱۲ر جنوری ۱۹۳۴ء کو بہار میں ہولناک زلزلہ آیا۔ میری ویلفیئر سوسائٹی نے سب سے بہترین کارگردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی تعریف گاندھی جی کے سامنے راجندر پرشاد نے کی۔ ۳۱ر مئی ۱۹۳۵ء کو زلزلے سے پورا کوئٹہ شہر برباد ہوگیا۔ اس موقع پر بھی میری سوسائٹی پیش پیش تھی۔ میری ان فلاحی خدمات کو اس زمانے کے وائسرائے نے بھی سراہا۔

میرا کہنا تھا کہ انسانوں کی فلاح و بہبود سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں۔ اگر آپ دولت سے حقیقی مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس دولت کو دوسروں کے بھی کام آنے دیجیے۔ اگر ہم راحت اور سکون سے زندگی گزارانا چاہتے ہیں تو ہمیں دوسروں سے محبت کرنی چاہیے۔ سب زبانیں بولنے والے بھائی بھائی ہیں۔

قائداعظم مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے علاحدہ وطن کے لیے سرگرمی سے کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں جب انھوں نے کلکتے کا دورہ کیا تو میمن برادری نے سپاسنامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور جلسے کی صدارت کے لیے مجھے دعوت دی گئی۔ یہ جلسہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۷ء کو منعقد ہوا جس میں حسین شہید سہروردی، شیر بنگال مولوی فضل حق اور خواجہ ناظم الدین بھی شریک تھے۔ قائداعظم نے فرمایا کہ میمن جیسی تاجر اور سمجھ دار قوم میرا ساتھ دے رہی ہے، اس سے مسلم لیگ میں کام کرنے کا میرا اعتماد زیادہ مضبوط ہوگیا ہے۔

قائداعظم نے مجھ سے پوچھا: ''بنگال کے مسلمانوں کو مسلم لیگی بنانے میں کتنا وقت لگے گا؟''

میں نے کہا: ''تین مہینے۔''

قائداعظم نے کہا: ''میں آپ کو چھے ماہ دیتا ہوں۔''

میری کوششوں سے کئی ممتاز شخصیات مسلم لیگ میں شامل ہوئیں۔

میں نے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم نے مجھے اہم مذاکرات کے لیے بلایا۔ اس میٹنگ میں اس وقت کے وزیرِ خزانہ غلام محمد بھی موجود تھے۔ اس موقع پر قائداعظم نے مجھے پاکستان کی معیشت کے مختصر حال سے آگاہ کیا اور پاکستان کی مالی حالت کے بارے میں بتایا: ''پاکستان کو تقسیم ہند کے وقت اپنے حصے کی جو رقم ملنی تھی، اس میں سے تھوڑی رقم ملی ہے، باقی بھارت نے روک لی ہے۔ حکومت کے پاس کاغذ پنسل خریدنے تک کے پیسے نہیں ہیں اور نہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے لیے رقم ہے۔ اب پاکستان کو فوری مالی تعاون کی ضرورت ہے۔''

میں نے کہا: ''میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ پاکستان کے لیے ہے۔ میں اس کی بقا اور استحکام کے لیے اپنی تمام دولت خرچ کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی چیک بک نکالی، چیکوں پر دستخط کر کے قائداعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا: ''یہ سادے چیک قبول کیجیے اور آپ کو جتنی رقم درکار ہو، اس میں درج کر لیں۔''

۱۹۳۸ء میں شہنشاہ جارج ہشتم کی سال گرہ کے موقع پر مجھے ''سر'' کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ نے قرارداد پاس کی کہ مسلمان سر کا خطاب چھوڑ دیں تو میں نے بھی یہ خطاب چھوڑ دیا۔ قائداعظم کے کہنے پر میں نے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان آ کر میں نے مسلم کمرشل بینک اور ایک انشورنس کمپنی قائم کی۔ ۱۹۴۸ء میں میں نے کاروبار اپنے بیٹوں کے سپرد کر کے آرام کرنے کا ارادہ کیا۔

۲۴ رجنوری ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام کے سلسلے میں مشورے کے لیے میٹنگ میں بلوایا۔ ۲۵ رجنوری کو میں کراچی آیا۔ میٹنگ جاری تھی کہ اچانک دل کا دورہ پڑ گیا۔ قائداعظم کے ذاتی معالج کرنل شاہ نے طبی امداد دی۔ دوسرے دن ۲۷ رجنوری، منگل کو رات ساڑھے دس بجے میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

شین شرارت

طنز و مزاح کے اس نئے سلسلے میں لطائف، مزاحیہ واقعات، مزاحیہ اشعار، دلچسپ کارٹون یا تصاویر بھی بھجوائی جاسکتی ہیں

ایک نوجوان انٹرویو دینے کے لیے ایک فرم میں گیا۔ مالک نے پوچھا: ''اس سے پہلے تو کیا کام کرتے تھے؟''

نوجوان نے کہا: ''میں اپنے بھائی کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا۔''

تمھارا بھائی کیا کام کرتا ہے؟'' مالک نے پوچھا۔

نوجوان نے بتایا: ''وہ نوکری کی تلاش کر رہا ہے۔''

عدیل احمد، سرگودھا

ایک تاجر اپنے کارندوں کو کچھ اس طرح ڈانٹ رہا تھا: ''تم لوگوں میں ذرا بھی خوفِ خدا نہیں ہے۔ غضب خدا کا اعلا درجے کی سرخ انٹیں چھوڑ کر تم گھٹیا اینٹیں ملاتے ہو مرچوں میں۔''

خدیجہ صمد، دنگیر

میاں بیوی میں بحث ہو رہی تھی کہ کون زیادہ قابل ہے۔

میاں بولے: ''میں ایف اے ہوں۔''

بیوی نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

''فادر آف اسلم۔''

بیوی نے کہا: ''میں ایم اے ہوں۔''

میاں نے پوچھا: ''تم کیسے ایم اے ہوگئیں؟''

بیوی نے جواب دیا: ''مدر آف اسلم۔''

وجیہ متین، نارتھ کراچی

ایک نوجوان نے بہت اُداس لہجے میں اپنے دوست سے کہا: ''ظلم و زیادتی کی حد ہوگئی ہے۔ میں اپنے دولت مند چچا کو دفن کرنے والا تھا کہ پولیس نے مجھے روک دیا اور کہا کہ تم اپنے چچا کو دفن نہیں کر سکتے۔''

دوست نے پوچھا: ''حیرت ہے انھوں نے ایسا کیوں کہا۔''

''وجہ یہ تھی کہ میرے چچا زندہ تھے۔''

نیلوفر، سکھر

ایک دوست نے دوسرے سے کہا: ''میں اور میری والدہ دونوں مستقبل کا علم جانتے ہیں۔''

دوسرے دوست نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

پہلے دوست نے جواب دیا: ''مثلاً جب بادل چھا جاتے ہیں تو میری والدہ کہتی ہیں کہ بارش ہوگی، جب کہ میں کہتا ہوں کہ نہیں ہوگی۔ اس طرح کبھی ان کی بات سچ ثابت ہوتی ہے، کبھی میری پیشن گوئی درست ثابت ہوتی ہے۔

آمینہ کونین، بلدیہ ٹاؤن

مالک مکان نے نئے کرائے دار سے پوچھا:

''آپ کے بچے بھی ہیں؟''

ان صاحب نے جواب دیا: ''جی ہاں چھے، سب کے سب قبرستان میں ہیں۔''

مالک مکان نے یہ سن کر افسوس کرتے ہوئے کرائے نامے پر دستخط کرتے ہوئے مکان کی

چابی کرائے دار کو تھما دی۔ ابھی مالک مکان زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ چھے کے چھے بچے قبرستان سے واپس آ گئے، جہاں وہ کھیلنے گئے ہوئے تھے، لیکن اب کرایہ نامہ منسوخ نہیں ہو سکتا تھا۔

ایہاریان سحر، کراچی

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے نئے افسر کی دعوت کی۔ افسر کی ناک خاصی لمبی تھی۔ میزبان نے اپنے پانچ سالہ بچے کو تاکید کی کہ خبردار! تم ان کی ناک کو دیکھ کر ہنسو گے نہیں اور نہ ناک کھجانا۔

شام کو افسر صاحب گھر پہنچے تو بچے نے ادب سے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ دونوں میاں بیوی نے سکھ کا سانس لیا، لیکن بیوی کے ذہن پر ناک ہی حاوی رہی۔ بیوی نے افسر کے لیے چائے بناتے ہوئے پوچھا: ''چینی کتنی ڈالوں آپ کی ناک میں؟''

سید باذل علی ہاشمی، کورنگی

فوج کے ایک اعلا افسر نے ایک رنگ روٹ کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا: ''تم ہی وہ سپاہی ہو نا جس نے سوپ میں مٹی پائے جانے کی شکایت کی تھی؟''

سپاہی نے کہا: ''جی ہاں جناب!''

اعلا افسر طنزیہ لہجے میں بولا: ''تم فوج میں مادرِ وطن کی خدمت کے لیے شامل ہوئے ہو یا خراب غذا کی شکایت کرنے کے لیے؟''

سپاہی نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا: ''جناب! میں فوج میں مادرِ وطن کی خدمت کرنے کے لیے شامل ہوا ہوں، اسے کھانے کے لیے نہیں۔''

خرم خان، شمالی کراچی

استاد شاگرد سے: مجھ سے ریاضی کا کوئی سوال پوچھو، حل نہ کیا تو ۵۰ روپے انعام۔

شاگرد: پانی میں ۵ بطخیں جا رہی تھیں۔ درمیان والی بطخ بولی: میرے پیچھے ۳ اور میرے آگے ۵ بطخیں ہیں... حل کرو سر۔

استاد: یہ لو ۵۰ رُپے اور تم حل کرو۔

شاگرد ۵۰ رُپے جیب میں ڈال کر بولا: سر درمیان والی بطخ جھوٹ بول رہی تھی۔

اسریٰ جاوید، کراچی

ٹیچر: تمھارے ابو کتنے سال کے ہیں؟

اسٹوڈنٹ: سر جتنے سال کا میں ہوں۔

ٹیچر: وہ کیسے؟

اسٹوڈنٹ: جس دن میں پیدا ہوا اُسی دن تو وہ ابو بنے۔

لیزا جاوید خان، کراچی

امتحان کی تیاری کا بس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے

Press ad

Page 37

Press ad

Page 38

گاؤں میں بارش

رفیع یوسفی محرّم

بجلی کڑکی ، بادل گرجے
سہم کے رہ گئے بوڑھے بچے
ایسی زور کی بارش برسی
ابتر ہوگئی حالت سب کی
کھیت ہوئے ، کھلیان ہوئے
جل تھل سب میدان ہوئے
ڈوب گئے ہیں رستے سارے
بھاگ رہے ہیں ڈھور بے چارے
پانی پانی ، ندی نالے!
جائیں کدھر کو گاؤں والے
بالن لکڑی گیلی ہوگئی
ماچس ، وہ بھی سیلی ہوگئی
اپنا چولہا کیسے جلائیں
روٹی ہانڈی کیسے پکائیں
گھر میں پانی بھرنے لگا ہے
کچا کوٹھا گرنے لگا ہے
کیسے گزری رات نہ جانے
جس پر گزرے وہ ہی جانے

ڈھور : جانور بالن : جلانے کی لکڑی

Press ad

Page 40

ڈائنوسارز

گمشدہ مخلوق جسے ڈاکٹر مینٹل نے ڈھونڈ نکالا

ڈاکٹر سیّدہ صدف اکبر

ڈائنوسارز ایک ایسی قدیم، پُراسرار اور گمشدہ حقیقت ہیں جن کا نام سنتے ہی جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ جاتی ہے، مگر ہم پھر بھی ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں کہ یہ مخلوق اس کرۂ ارض پر کب اور کیسے وجود میں آئی اور انسان کو ان کی موجودگی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔

ڈائنوسارز قدیم زمانے میں پائے جانے والے بھاری بھرکم جان دار تھے جو اگرچہ طویل عرصے کرۂ ارض پر موجود رہے، مگر ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ لوگ ان کے وجود سے لاعلم تھے۔ ایک انگریز ڈاکٹر ''گڈیون مینٹل''، جو مختلف جانوروں کے فوسلز اور پتھر وغیرہ جمع کرنے کے شوقین تھے، انھوں نے ڈائنوسارز کی ہڈیوں کو دریافت کیا۔

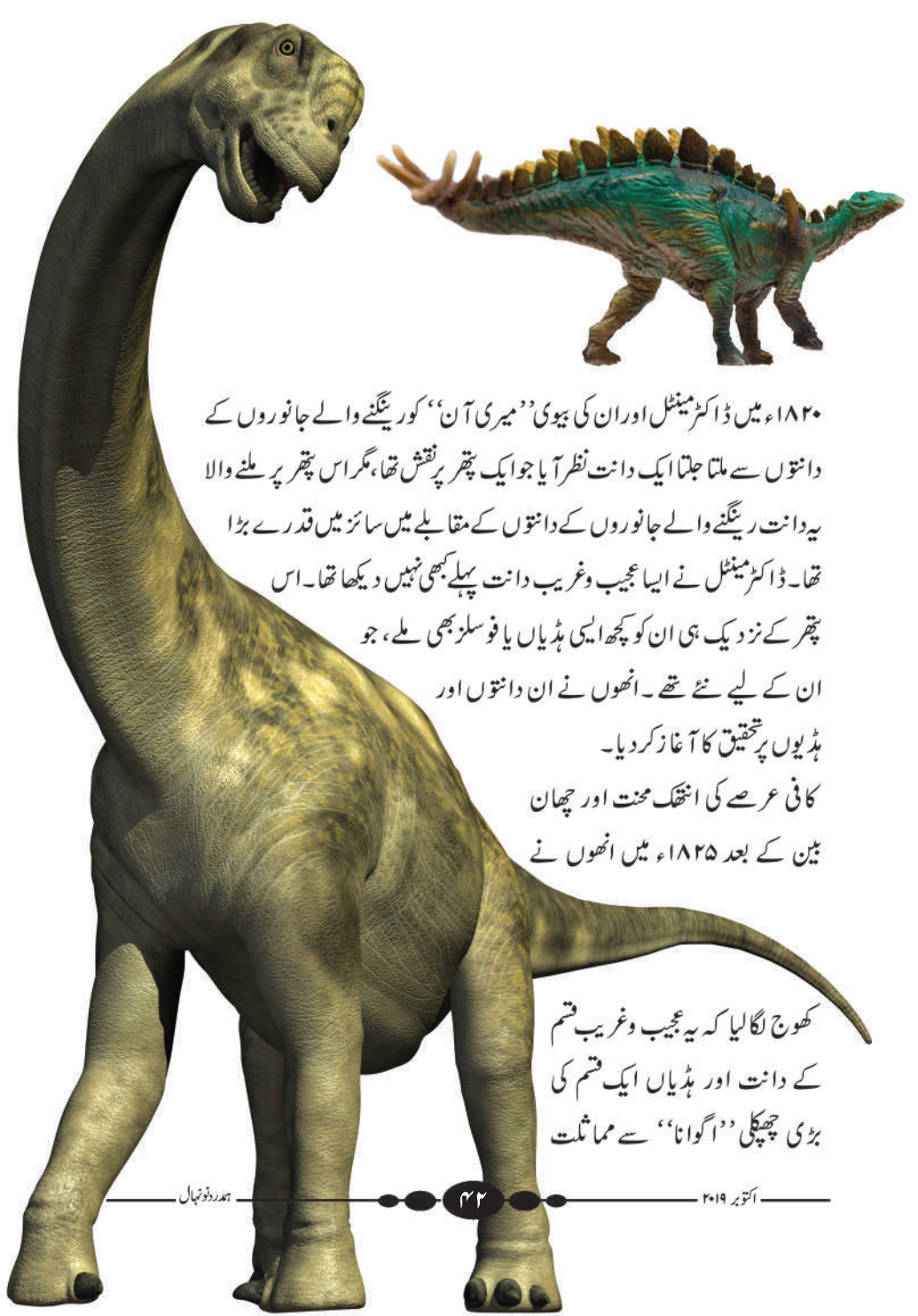

۱۸۲۰ء میں ڈاکٹر مینٹل اور ان کی بیوی ''میری آن'' کو رینگنے والے جانوروں کے دانتوں سے ملتا جلتا ایک دانت نظر آیا جو ایک پتھر پر نقش تھا، مگر اس پتھر پر ملنے والا یہ دانت رینگنے والے جانوروں کے دانتوں کے مقابلے میں سائز میں قدرے بڑا تھا۔ ڈاکٹر مینٹل نے ایسا عجیب وغریب دانت پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس پتھر کے نزدیک ہی ان کو کچھ ایسی ہڈیاں یا فوسلز بھی ملے، جو ان کے لیے نئے تھے۔ انھوں نے ان دانتوں اور ہڈیوں پر تحقیق کا آغاز کر دیا۔

کافی عرصے کی انتھک محنت اور چھان بین کے بعد ۱۸۲۵ء میں انھوں نے کھوج لگا لیا کہ یہ عجیب وغریب قسم کے دانت اور ہڈیاں ایک قسم کی بڑی چھپکلی ''اگوانا'' سے مماثلت

ہیں، جس کا تعلق رپٹائل (رینگنے والے جانور) کے ہی خاندان سے ہے۔اس لیے انھوں نے اسے اگوانڈون (Iguanodon) کا نام دیا، جس کا مطلب ''اگوانا کے دانت والا'' ہے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد دو اور مختلف رپٹائلز دریافت ہوئے، جن کے نام میگالوسارس اور ہائیلیوسارس تھے، مگر ۱۸۴۱ء تک ان مختلف اقسام کے رپٹائلز کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا تھا۔

کچھ عرصے بعد ایک مشہور سائنس دان سر رچرڈ اوون جو ایک مشہور برطانوی ماہر علم تشریح اور برطانوی عجائب گھر کے پہلے نگراں تھے، انھوں نے تمام عجیب و غریب رپٹائلز خصوصاً اگوانڈون اور میگالو سارس کی ہڈیوں کا بہ غور مشاہدہ کرتے ہوئے اندازہ لگایا کہ کرۂ ارض پر رینگنے والے جانداروں کا یہ ایک ایسا گروپ تھا، جن کی اس وقت تک کوئی درجہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ جس کے بعد سر رچرڈ اوون نے انھیں مشترکہ طور پر ڈائنوسارز کا نام دیا جو کہ یونانی زبان کے ایک لفظ سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ''خوف ناک چھپکلی'' ہے۔ اس کے بعد سے سائنسی تحقیق کی دنیا میں ایک ایسے سنسنی خیز کام کا آغاز ہو گیا جو ہر عمر کے فرد کے لیے قابل توجہ تھا۔

ڈائنوسارز اگرچہ رپٹائلز کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر رپٹائلز کے برعکس ڈائنوسارز کی ٹانگیں لمبی تھیں، جو ان کے جسم کے اندر دھنسی ہوئی ہوتی تھیں، تاکہ ان کو نقل و حرکت میں آسانی رہے۔

نونہال مصوّر

زینب سمی، لاہور

ایمن شاہد، راولپنڈی

نمرا فیصل

ہما امانی، کراچی

اصغر علی، کوٹری

فاطمہ بختیار، کراچی

آمنہ بختاور، کراچی

عبدالکریم، کوٹری

اسریٰ جاوید، کراچی

لیزا جاوید خان، کراچی

Press ad

Page 46

قسط ۵

سفرنامۂ امریکا

سلیم مغل

نئی منزلوں کا سفر

میں ابھی لاس اینجلس ہی میں ہوں، دو روز تک وسیم بھائی اور ثنا خان کے ساتھ رہنے کے بعد اب سعدیہ کی طرف روانگی ہے۔ سعدیہ میری یونی ورسٹی فیلو ہیں، یونی ورسٹی میں معاشیات کی طالبہ تھیں۔ پھر سعدیہ سے سعدیہ سہیل ہوئیں اور امریکا چلی آئیں۔ لاس اینجلس کے علاقے ’’کرونا‘‘ میں واقع ان کا گھر اور اطراف کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسین درختوں کے جھرمٹ، پھولوں سے لدے ہوئے پودے، صاف ستھری سڑکیں اور اس حسین منظر کے بیچوں بیچ سعدیہ کا خوب صورت گھر۔ گھر کا حُسن تو گھر کے مکینوں سے ہے۔ اس لیے تو سعدیہ، سہیل بھائی اور ان کے تینوں بچے اس گھر کو جنت بنائے ہوئے ہیں۔ مریم عائشہ اور فاطمہ تینوں برکلے یونی ورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ برکلے یونی ورسٹی کا شمار دنیا کی بہترین یونی ورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اس حوالے سے تینوں بچے، اچھے، لائق فائق اور نہایت باصلاحیت ہیں۔ اللہ انھیں نظرِ بد سے بچائے، آمین۔

HOLLYWOOD

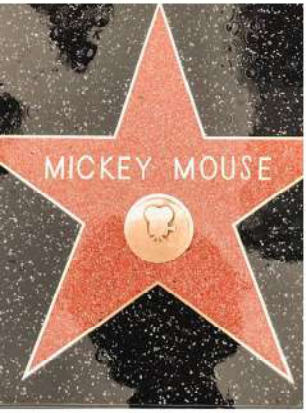
MICKEY MOUSE

CONSULATE GENERAL OF PAKISTAN
LOS ANGELES

بلا مبالغہ سعدیہ اس علاقے کی سب سے زیادہ متحرک اور مستعد خاتون ہیں۔ممکن نہیں کہ پاکستانی کمیونٹی کا کوئی فرد انھیں نہ جانتا ہو۔وہ کون سا شعبہ ہے جہاں سعدیہ نظر نہ آتی ہوں۔سیاست سے ثقافت تک، روایتی تہواروں سے شعروادب تک، ثقافتی پروگرامز سے سیاحتی منصوبوں تک، سعدیہ ہر جگہ سب سے آگے، ہر جگہ بہت مقبول۔اللہ انھیں نظرِ بد سے بچائے۔ان کا گھر آئے دنوں تقریبات کا مرکز بنا رہتا ہے۔دوست احباب کی دعوتیں کرنا اور تفریح طبع کے پروگرام منظّم کرنا ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں، اسی لیے گھر کا پچھواڑا باربی کیوٹو نائٹ کا منظر پیش کرتا ہے۔

ثنا تسنیم خان نے مجھے سعدیہ کے حوالے کیا اور واپس چلی گئیں۔ہم بھی وقت ضائع کیے بغیر اپنی اگلی منزل کی طرف چل دیے مگر کون سی منزل یہ ابھی میرے لیے بھی پہیلی کی طرح تھا۔سعدیہ کی فراٹے بھرتی ہوئی کار تھوڑی دیر میں جس گھر کے سامنے جا کر رکی، یہ گھر عرفان مرتضٰی صاحب کا تھا۔یہ بھی باکمال شخصیت ہیں۔ان کے گھر کے ڈرائنگ روم پہ کسی آرٹ گیلری کا گمان ہوتا ہے۔یہاں رکھی ہوئی ڈھیر ساری پینٹنگز عرفان صاحب کی اپنی تخلیق کردہ تھیں۔نہایت خوب صورت بہت جاذبِ نظر، میں دیر تک مسحور اور مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔

عرفان مرتضٰی اچھے مصوّر ہونے کے علاوہ خوب صورت شاعر بھی ہیں، خصوصاً نظموں میں ان کا ایک منفرد انداز پڑھنے والوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔ان کی سب خوبیاں ایک طرف، مگر یہ جان کر تو مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ عرفان صاحب کراٹے میں بلیک بیلٹ بھی ہیں۔کراٹے کے معروف کھلاڑی اور استاد اشرف طائی صاحب کے شاگرد ہیں۔چوں کہ اشرف طائی صاحب سے میرے بھی پرانے مراسم ہیں اس لیے پرانی باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور یادوں کی زنبیل کھلتی چلی گئی۔باتوں باتوں میں بہت سے ڈاکخانے ملنے لگے۔سچ کہتا ہوں اگر عرفان صاحب کے ساتھ ایک لاکھ میل کا سفر بھی کرنا پڑتے تو آپ بور نہیں ہو سکتے۔لطیفے، اشعار اور قہقہے آپ کے ہم سفر ہوں گے اور آپ کو طویل راستہ بھی مختصر ہوتا ہوا محسوس ہوگا۔

کیلی فورنیا کے علاقے Anahem hills میں عرفان صاحب کے گھر سے روانگی کے بعد

ہماری کار کی پہلی بریک Santa monica پہنچ کر لگی۔ سانتا مونیکا کیلی فورنیا کا نہایت خوب صورت شہر ہے جو بہ یک وقت شہر اور مضافات کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہاں پر ہم نے پاکستان کے کونسل جنرل محترم عبدالجبار میمن سے ملاقات کی جو پہلے سے طے تھی۔ عبدالجبار میمن صاحب سے دل چسپ مکالمے ہوئے، پتا چلا کہ آپ کا تعلق حیدر آباد کے قریب واقع شہر ٹنڈو جام سے ہے۔ ٹنڈو جام میرے گھر کی راہ گزر پہ واقع سندھ کا مشہور شہر ہے۔ یہاں کی زرعی یونی ورسٹی دنیا بھر میں شہرت رکھتی ہے۔ میرے بہت سے دوست اس شہر میں رہتے ہیں۔ گپ شپ میں مشترکہ دوستوں کے نام آئے تو آتے چلے گئے۔ بردار محمد صادق سے لے کر مبارک احمد اور حسین حقانی تک سبھی کے تذکرے ہوئے۔ یہ تھوڑا سا وقت بہت اچھا گزرا۔ اس سفارتی مرکز میں ایک دیوار کو پاکستانی عمارت اور مشہور مقامات کی تصاویر سے سجا ہوا دیکھا تو اس کے تخلیق کار کو بے اختیار شاباش دینے کو جی چاہا۔ سوچیے اس وقت کتنا اچھا لگا ہوگا جب یہ معلوم ہوا کہ پاکستانی تصاویر سے سجی ہوئی یہ خوب صورت دیوار بھی برادم عرفان مرتضیٰ نے بنائی ہے..... واہ .....واہ..... واہ..... بے اختیار داد و تحسین کے پھول برسنا شروع ہوئے۔ عرفان صاحب کو خوب شاباش دی گئی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور بھوک نے ستایا ہوا تھا، اس لیے ایک ریستوران پہ رک کر کھانا کھایا۔ کھانا بہت مزے کا تھا، مگر پھر بھی بیگم کے ہاتھ کے دال چاول والی بات کہاں؟ یہیں بیٹھ کر پاکستان میں اشرف طائی صاحب سے باتیں کی۔ پرانے قصے دہرائے اور آگے بڑھ گئے۔

ہم نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ہمارا رخ ہالی وڈ کی طرف تھا۔ دنیا کا سب سے بڑا فلمی مرکز اور فلم کی بہت بڑی صنعت.....اور لیجیے ہم ہالی وڈ پہنچ بھی گئے۔

اس وقت ہم Griffith Park Mount Lee پہ ہیں۔ مشہور زمانہ ہالی وڈ سائن ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہالی وڈ کے قصے ہماری زبانوں پر۔ ہالی وڈ کو دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری سمجھا جاتا ہے، لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ فلموں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری بالی وڈ یعنی ممبئی ہے۔ البتہ ٹیکنالوجی، اسٹوڈیوز، مہارتوں اور بجٹس کے حوالے

سے ہالی وڈ بہت آگے ہے۔ دنیا بھر کی بہترین فیچر فلمیں یہیں بنتی ہیں۔ ان کی نقل انڈیا میں اور پھر تیسرے درجے کے تجربے ہمارے ہاں ہوتے ہیں۔ چارلی چپلن کی پہلی خاموش فلم Mocking Hitler with his own money بھی انہی اسٹوڈیوز میں بنی تھی۔ دنیا کی پہلی ''ٹاکی'' یعنی بولتی ہوئی فلم بھی ہالی وڈ میں تیار ہوئی تھی۔ اس فلم کا نام'' The Jazz Singer'' تھا۔ ہالی وڈ کی پہلی فلم ۱۹۱۰ء میں بنائی گئی جس کا دورانیہ ۱۷ منٹ تھا۔ اس فلم کا ٹائٹل تھا''Old Holly Wood''۔

ہالی وڈ کو ایسی شہرت نصیب ہوئی کہ اس سے ملتے جلتے نام دنیا کی تمام فلم انڈسٹریز نے رکھنا شروع کر دیے۔ انڈیا نے اپنی فلم انڈسٹری کا نام ''بالی وڈ'' اس زمانے میں رکھا جب ممبئی نہیں، بمبئی ہوا کرتا تھا۔ پاکستان نے لاہور کی نسبت سے اسے ''لالی وڈ'' کہا۔ چین نے'' چائنا وڈ'' انڈسٹری بنا ڈالی۔ ہالی وڈ کو اس بات پہ بہت ناز ہے کہ اس نے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا تفریحی مرکز ہونے کا اعزاز حاصل کیا، بلکہ آمدنی بہ ذریعہ تفریح کے نئے ریکارڈز بھی بنا ڈالے۔

''ہالی وڈ ہلز'' سے اُتر کر ہم Walk of Fame پہنچے۔ یہ بھی کیا مزے کی جگہ ہے۔ ایک طویل فٹ پاتھ پر پانچ کونوں والے ۲۶۰۰ ستارے بنے ہوئے ہیں۔ ہر ستارے پر کسی مشہور اداکار، صداکار، ہدایت کار، کھلاڑی یا دیگر شعبوں کی مشہور شخصیات کے نام پیتل کے دھات سے لکھے ہوئے ہیں۔ لوگ ان ناموں کے ساتھ بیٹھ کر، لیٹ کر، کھڑے ہو کر اپنی تصاویر بنواتے ہیں۔ مشہور باکسر محمد علی کلے کا نام فٹ پاتھ پر لکھا جانے لگا تو محمد علی نے درخواست کی کہ ''نامِ محمد ؐ'' کے احترام کا تقاضا ہے کہ اسے فرش پر نہ لکھا جائے۔ محمد علی کلے کی درخواست قبول ہوئی اور ان کا نام اس دیوار پر لکھا گیا، جسے'' کوڈک وال'' کہا جاتا ہے۔ ہم نے یہاں نہ صرف دیر تک واک کی، بلکہ انڈسٹری کے بعض ستاروں سے ملاقات بھی کی۔ مختلف شوٹس کے منظر بھی دیکھے۔ یقیناً یہ دورہ کئی حوالوں سے ایک خوب صورت تجربہ تھا۔

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہالی وڈ سے قبل نیو جرسی امریکا کا سب سے بڑا فلمی مرکز تھا، مگر اس علاقے میں ایڈیسن کی اجارہ داری تھی اور وہ ہر وقت فلم سازوں کو ان کی ٹیکنالوجی کو پیٹنٹ کروانے

کے لیے دباؤ ڈالتا رہتا تھا۔فلم انڈسٹری کے لوگ قانونی پیچیدگیوں سے بھاگنا چاہتے تھے،لہٰذا انھیں کیلی فورنیا کی طرف بھاگ نکلنے میں عافیت نظر آئی۔اس نئے علاقے میں نہ تو زمین کا مسئلہ تھا اور نہ افراد کا،اس لیے اس انڈسٹری کی بنیاد یہاں پہ رکھ دی گئی۔

کیلی فورنیا،فلم انڈسٹری کو راس آ گیا۔یہاں دنیا بھر میں شہرت پانے والی، باکس آفس پہ ہٹ ہونے والی اور فنون لطیفہ کی دنیا میں نام کمانے والی اَن گنت فلمیں بنیں۔دنیا بھر میں امریکی پروپگنڈے کو بھی ہمیشہ ہالی وڈ کی سرپرستی حاصل رہی۔بہت سی پروپگنڈا فلمیں یہاں بنائیں گئیں۔خصوصاً سوویت یونین کے عہد میں ایسی فلمیں بنیں جس نے سرخ انقلاب کا راستہ روکنے کی کوشش کی....سعدیہ اور عرفان بھائی کے ساتھ ہالی وڈ کا یہ طوفانی دورہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

سورج غروب ہونے کو آیا تو ہم نے واپسی کا راستہ لیا۔سعدیہ سہیل اور عرفان مرتضیٰ کا ساتھ نہ ہوتا تو یہ سفر اتنا پُر لطف کبھی نہ ہوتا۔رات ۹ بجے احباب اور ان کی بیگمات کے ساتھ ایک دیسی ریستوران میں منعقد ہونے والی ایک ادبی نشست اور اس کے بعد ایک پر تکلف عشائیے میں شریک ہوئے۔اس خوب صورت دعوت کا اہتمام سعدیہ اور ان کے میاں سہیل بھائی نے کیا تھا۔ثنا اور وسیم بھائی بھی شریک ہوئے۔میرا جی تو چاہ رہا ہے کہ ایک ایک شریک کا تعارف کرواؤں،مگر صفحات کی کمی کا احساس آڑے آ رہا ہے۔اس دعوت کا ہر شریک موتیوں اور نگینوں کی طرح قیمتی تھا،انہیں مل کر مزہ آیا،سن کر مزہ آیا۔ایسی محفلیں تو ہمیں کراچی میں بھی کم کم نصیب ہوتی ہیں۔سعدیہ اور عرفان بھائی خوش رہیں۔

دوسرے روز مجھے سان فرانسسکو جانا تھا۔اپنی بیٹی کے پاس جو میرے انتظار میں ایک ایک دن گن کر گزار رہی ہے۔اور کئی کئی بار فون کر کے پوچھتی ہے.....کب آئیں گے،کب آئیں گے؟ سعدیہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے چل دیں۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ''Lax'' ایئر پورٹ نظر آیا۔مجھے اس لمحے سعدیہ پہ بہت ترس آ رہا تھا۔میری خاطر اتنا طویل سفر جب کہ واپسی پہ کوئی ساتھ بھی نہ ہوگا۔سعدیہ تم بہت عظیم ہو۔شکریہ تمھارا،سہیل بھائی کا بچوں کا،ثنا کا اور ان سب کا جن کی محبتیں سمیٹ کر میں واپس جا رہا ہوں۔

پرانے کھنڈر کا
بھوت

جاوید اقبال

ہم شکار کی تلاش میں جنگل میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ہمیں بھاگتے قدموں کی آواز آئی، پھر ہم نے ایک بوڑھے آدمی کو بھاگتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہمارے قریب آ کر وہ رک گیا۔ وہ سخت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

''بھو.....بھو.....بھوت.....وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' اس نے اپنے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر ایک دم وہ لڑکھڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر جاتا، ہمارے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر اسے

تھام لیا اور حوصلہ دیتے ہوئے کہا: ''بزرگوار! گھبرائیں نہیں، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی بھوت آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، ہمیں اطمینان سے بتائیں آپ نے بھوت کو کہاں دیکھا ہے؟''

بوڑھے نے بتایا: ''میں پرانے کھنڈر کے پاس لکڑیاں جمع کر رہا تھا کہ بھوت نے کھنڈر سے نکل کر مجھے پکڑ لیا، پھر جانے کیسے میں اس کی گرفت سے نکل بھاگا اور یہاں تک پہنچ گیا۔''

ہم نے اس بوڑھے سے کہا کہ وہ ہمیں اس کھنڈر تک لے جائے۔ بوڑھا دوبارہ خوف زدہ ہو گیا اور ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا، مگر پھر ہمارے حوصلہ دلانے پر وہ ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔

ہم اونچے نیچے رستوں پر چلتے ایک کھنڈر نما عمارت کے سامنے جا پہنچے۔

''یہی وہ کھنڈر ہے جس سے بھوت نکلا تھا۔'' بوڑھے نے بتایا۔ ہم بوڑھے کو وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر کھنڈر کی طرف بڑھے۔

یہ ایک بہت ہی پرانی عمارت تھی۔ جگہ جگہ سے سیمنٹ اُکھڑا ہوا تھا اور بُھربُھری سرخ اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ اندر گُھپ اندھیرا تھا، ہم ٹارچ جلا کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر چھت کی پرانی لکڑیوں سے چمگادڑیں چمٹی ہوئی تھیں۔ ہماری آہٹ سے وہ اِدھر اُدھر اُڑنے لگیں۔ ہم نیچے جھک کر ان سے بچتے بچاتے بھوت کو ڈھونڈنے لگے، مگر بھوت کہیں نظر نہ آیا۔ ہم نے سب کونے کھدرے دیکھ لیے پھر ہمیں وہاں لکڑی کی پرانی سیڑھیاں نظر آئیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ جیسے ہی ہم نے چھت کے فرش پر قدم رکھا چھت لرزنے لگی۔ یوں لگا جیسے چھت ابھی گر جائے گی۔ اچانک ایک سیاہ بھوت ایک تاریک کونے سے نکل کر ہمارے ایک ساتھی پہ جھپٹا۔ بھوت نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک لکڑی سے ہمارے ساتھی کے سر پر وار کیا۔ ہمارا ساتھی چوٹ کھا کر لڑکھڑایا اور چکرا کر گر پڑا۔ میں نے آگے بڑھ کر بھوت کو پکڑنا چاہا تو بھوت نے پلٹ کر مجھ پر لکڑی سے وار کیا۔ میں ایک دم نیچے جھک گیا۔ اس کا وار خالی گیا۔ ہمارے دوسرے ساتھی نے

جھپٹ کر بھوت پر قابو پا لیا۔

بھوت نے زبردست مزاحمت کی، مگر پھر ہتھیار ڈال دیے اور پھر اس کے منھ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی: ''مجھے چھوڑ دو۔'' ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر بھوت کو رسی سے جکڑ دیا۔ ہمارا زخمی ساتھی بھی ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا گومڑ اُبھر آیا تھا، مگر خدا کا شکر کہ ہڈی بچ گئی تھی۔ ہم بھوت کو لے کر کھنڈر سے باہر آ گئے۔

''یہی ہے وہ بھوت۔'' بوڑھا اسے دیکھتے ہی چیخ اُٹھا اور ڈر کر بھاگنا چاہا، مگر ہم نے اس سے کہا کہ وہ بالکل نہ گھبرائے، یہ بھوت اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس بھوت کو لے کر ہم قریبی تھانے پہنچ گئے۔ پولیس نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ یہ شخص ایک سنگین جرم کر کے بھاگا ہوا تھا اور قانون سے بچنے کے لیے اس کھنڈر میں آ چھپا تھا۔ پرانے کھنڈر میں رہتے ہوئے اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور دھول میں اَٹ کر وہ بھوت جیسا بن گیا تھا۔ یہ تنہا مسافروں کو پکڑ کر کھانے کی چیزیں چھین لیتا۔ بوڑھے کو بھی اس نے اسی نیت سے پکڑنا چاہا، مگر خود قانون کی گرفت میں آ گیا۔

غلط فہمی

محمد ذوالقرنین خان

پروفیسر علیم کی گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اب تک کئی مکینک اس پر سر کھپا چکے تھے، مگر نقص کوئی نہیں پکڑ سکا تھا۔ علیم صاحب کے دوست پروفیسر صدیقی نے انھیں اپنے بہنوئی کے گیراج کا پتا دے کر کہا تھا کہ وہاں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ حال ہی میں ان کا تبادلہ اس شہر میں ہوا تھا۔ راستوں سے ناواقفیت کی وجہ سے گیراج تلاش کرنے میں

انھیں دقت پیش آئی۔ خدا خدا کر کے وہ اس تک پہنچ ہی گئے۔ گاڑی ایک طرف لگا کر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں بہت ساری گاڑیاں کھڑی تھیں اور ہر گاڑی پر کام ہو رہا تھا۔

پروفیسر کچھ دیر تو تذبذب کے عالم میں کھڑے رہے پھر جب کسی نے ان پر توجہ نہیں دی تو قریب کھڑے ایک جوان مکینک کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا، جو ایک عجیب سے نمونے کی گاڑی کا بونٹ اُٹھائے بہت انہماک سے اپنا کام کر رہا تھا۔

''ارے میاں! ہمیں گاڑی ٹھیک کرانی ہے۔''

اس مکینک نے ان پر سرسری نگاہ ڈالی اور ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولا: ''دفتر سے پرچی بنالیں۔ کوئی مکینک دستیاب ہوا تو ابھی آپ کے ساتھ بھجوا دیں گے، ورنہ.....سر! آپ علیم صاحب ہیں؟'' مکینک نے بات ادھوری چھوڑ کر انھیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

''سر! میں آپ کا نالائق طالب علم نعمان ہوں۔'' وہ مسرت سے بولا۔

اگلے ہی لمحے وہ اسے پہچان چکے تھے۔ وہ اسے بھول بھی کیسے سکتے تھے۔ پروفیسر صاحب کی نگاہوں کے سامنے بارہ سال قبل پیش آنے والا ایک تکلیف دہ واقعہ گھوم گیا۔ انھوں نے تاسف سے اسے دیکھا۔ نعمان نے اپنا کام وہیں چھوڑا اور پروفیسر صاحب کی گاڑی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اسے پروفیسر صاحب کی گاڑی کا بونٹ کھولتے دیکھ کر ایک دو مکینک دوڑے چلے آئے، مگر اس نے دونوں کو واپس بھیج دیا۔ نعمان نے پروفیسر صاحب کو قریب ہی ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

ایک غلط فہمی کی وجہ سے نعمان کو کالج سے نکال دیا گیا۔ اب اتنے برسوں بعد نعمان سے پروفیسر علیم کی اچانک ملاقات ایسے حالات میں ہوئی تھی کہ منھ موڑ کر جا بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ اسے ایک کام یاب انسان بنانا چاہتے تھے۔ پروفیسر صاحب دیکھ رہے تھے کہ نعمان بڑی محویت سے ان کی

گاڑی کو ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ایک مکینک بھی اس کی مدد کو چلا آیا تھا۔

''چلو، کوئی بات نہیں اب وہ رزقِ حلال کما رہا ہے، کسی غلط صحبت کا شکار تو نہیں ہوا۔'' انھوں نے زیرِ لب کہا۔ کچھ دیر بعد نعمان ان کی طرف آیا۔

''سر! گاڑی میں کچھ کام رہ گیا ہے۔ اسے میرا ساتھی دیکھ لے گا۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔ کھانا میرے ساتھ کھائیں گے۔'' اس نے بہت اپنائیت سے کہا۔

علیم صاحب نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ احترام سے انھیں پکڑ کر ایک صاف ستھرے کمرے میں لے آیا۔ جب وہ واش روم سے ہاتھ منھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے آیا تو مکینک بالکل نہیں لگ رہا تھا۔

''تم یہاں کام کرتے ہو؟'' اس کے بدلے ہوئے حلیے کو دیکھ کر علیم صاحب نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''سر! یہ گیراج ابا جی کا ہے۔ میں کبھی کبھار چکر لگا لیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر مسکرایا اور انٹر کام پر کسی کو کھانا لانے کو کہا۔

کھانے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی، مگر ماضی کی کسی بات کا ذکر نہیں ہوا۔ نعمان کے اچھے اخلاق کی وجہ سے علیم صاحب کے دل پر جمی کدورت کسی حد تک دور ہو گئی۔ گاڑی کا کام مکمل ہونے کے بعد علیم صاحب نے جب اُجرت پوچھی تو نعمان نے صاف لفظوں میں یہ کہتے ہوئے پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ گیراج ہمارا اپنا ہے۔ میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ سے پیسے لوں۔ اس نے علیم صاحب کی ایک نہ چلنے دی اور انھیں گاڑی میں بٹھا کر ہی دم لیا۔

اگلے دن پروفیسر صدیقی نے انھیں فون کیا: ''ارے صاحب! آپ تو وہ شخص نکلے، جس کا تذکرہ برسوں سے ہمارے خاندان میں ہوتا رہا ہے۔'' انھوں نے جوش سے کہا۔

علیم صاحب یہ سن کر حیران ہوئے: ''میں سمجھا نہیں۔''

''میرا بھانجا نعمان کبھی آپ کا شاگرد رہا ہے؟'' انھوں نے تصدیق چاہی۔
علیم صاحب نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔
''آپ یوں کریں کہ شام کو میرے گھر آئیں۔'' صدیقی صاحب نے کہا۔
علیم صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھر لی۔
شام کو علیم صاحب پروفیسر صدیقی کے پاس موجود تھے۔ جب نعمان کا ذکر آیا تو علیم صاحب نے بنا لگی لپٹی رکھے صدیقی صاحب کو بتایا کہ اس لڑکے کو انھوں نے زمین سے اُٹھا کر عرش پر پہنچانا چاہا، مگر اس نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔''
صدیقی صاحب کو مایوس دیکھ کر علیم صاحب نے بات بدلتے ہوئے کہا: ''صدیقی! تمھارا بھانجا مکینک بہت اچھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے یہ ہنر سیکھ لیا اور اب اپنے والد کا گیراج سنبھال لے گا۔''
یہ سن کر پروفیسر صدیقی مسکرا دیے اور بولے: ''مگر وہ تو کچھ اور کرنا چاہتا ہے۔''
''کیا کرنا چاہ رہا ہے؟'' علیم صاحب نے تجسس سے پوچھا۔
''ابھی آئے گا خود پوچھ لینا۔'' پروفیسر صدیقی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔
تھوڑی دیر بعد نعمان بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔ علیم صاحب کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ کھل اُٹھا۔
''سر! جب انکل نے مجھے بتایا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو میں دوڑا آیا۔ میری خوش قسمتی ملاحظہ کریں کل آپ سے ملاقات ہوئی اور آج اٹامک انرجی کمیشن سے بلاوا آ گیا۔'' اس نے اپنے استاد کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔
علیم صاحب ہکا بکا اسے دیکھے جا رہے تھے۔ پروفیسر صدیقی نے کھنکار کر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا

اور بولے: ''آپ کا شاگرد امریکا سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ وہاں بہت سے اداروں کی جانب سے اسے کام کی پیش کش ہوئی، مگر یہ اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ شکر ہے اسے اٹامک والوں نے بلا لیا، ورنہ یہ تو آج کل دن بھر ایک نئی قسم کی گاڑی بنانے میں جتے رہتے ہیں۔'' صدیقی صاحب نے باتوں باتوں میں اس کے گیراج میں کام کرنے کی وجہ بتا دی۔ علیم صاحب کو بھی وہ عجیب وغریب گاڑی یاد آ گئی۔

''ماموں! آج اسی گاڑی میں آپ کے گھر آیا ہوں۔'' نعمان نے مسکرا کر صدیقی صاحب سے کہا۔

نعمان کے جانے کے بعد صدیقی صاحب نے حقائق سے پردہ اُٹھایا: ''اس دن جب نعمان ہال کے پاس سے گزر رہا تھا تو کسی لڑکے نے اس پر جملے کسے۔ یہاں تک بات رہتی تو نعمان برداشت کر لیتا، مگر جب اس نے آپ کا مذاق اُڑایا تو نعمان سے برداشت نہیں ہوا اور وہ اس لڑکے پر پِل پڑا۔ اس دوران انگریزی کے استاد نے انھیں چھڑانے کی کوشش کی تو ان دونوں میں سے کسی کا ہاتھ ان کے چہرے پر جا لگا اور خون بہنے لگا۔ نعمان کو اس وقت صدمہ پہنچا جب سب کی ہمدردی اس لڑکے کے ساتھ ہو گئی۔ نعمان کا ساتھ دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ آپ کی بلا تحقیق سفارش پر اسے ہنگامہ کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دیا گیا۔ اس دن کے بعد اس کی زندگی بدل گئی۔ اپنے اندر قابلیت پیدا کرنے کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیے تھے۔

یہ سب سننے کے بعد علیم صاحب بہت خوش بھی تھے اور ایک غلط فہمی کی وجہ سے افسردگی نے بھی انھیں گھیرا ہوا تھا۔

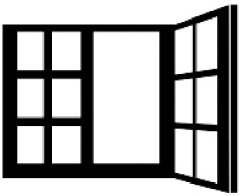

عِلم دریچے

مسلسل اور اچھا مطالعہ حصول علم کا بہترین ذریعہ ہے۔ مطالعہ کرتے ہوئے کوئی اچھی بات، کوئی اچھا قول، فکر انگیز مکالمہ، کوئی خوب صورت خیال نظر سے گزرے تو اسے اپنے علاوہ دوسروں کے لیے بھی محفوظ کر لیجئے۔ آپ جانتے ہیں ناں کہ علم کی تقسیم ہی علم کو ضرب دینے کے مترادف ہے۔ اپنی تحریر حوالہ کے ساتھ بھیجئے تاکہ اسے مستند سمجھا جائے۔

دریچے

معیزہ حمید، لاہور

دس تدابیر جن سے آپ کی صحت بہتر رہ سکتی ہے۔

۱۔ پانی زیادہ پئیں۔

۲۔ سبزیاں زیادہ کھائیں۔

۳۔ بغیر بھوک کے کھانا نہ کھائیں۔

۴۔ نمک اور چینی کا استعمال کم سے کم کریں۔

۵۔ روزانہ کم از کم آدھا گھنٹا ورزش کریں۔

۶۔ مطالعے کی عادت ڈالیں۔

۷۔ سوشل میڈیا پر کم سے کم وقت گزاریں۔

۸۔ گھر والوں اور اچھے دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گزاریں۔

۹۔ دوسروں کے لیے ہمیشہ اچھا سوچیے اور سچ بولیے۔

۱۰۔ غصہ نہ کیجیے۔ ہر معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔

دانتوں کی حفاظت

کبشہ ادریس

☆ دن میں کم از کم دو مرتبہ دانت بُرش ضرور کریں۔ مسواک زیادہ بہتر ہے۔

☆ اپنے دانتوں اور مسوڑھوں کو صحت مند اور طاقت ور رکھنے کے لیے سبزیوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔

☆ چاکلیٹ اور ٹافیوں کا استعمال کم کریں، کیوں کہ ان کے استعمال سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ دو منٹ کے

اندر منھ صاف کرلیں۔

گدھے چاہئیں

تحریر : ابنِ انشا

انتخاب : سعد محمود، حیدرآباد

سیاحت کے محکمے کے ایک پاکستانی وزیر جاپان تشریف لائے تھے۔ وقت ان کے پاس کم ہی تھا۔ سفارت خانے والوں نے جاپانی وزیر سیاحت یا نائب وزیر سیاحت سے ان کو ملوایا۔ جاپانی وزیر نے کہا کہ اگر پاکستان کو جاپان میں روشناس کرانا ہے تو ایک گدھا یہاں بھیج دیجیے۔

حاضرین نے بات کو ہنس کر ٹالنا چاہا، لیکن جاپانی وزیر اڑے ہوئے تھے کہ ہاتھی نہیں مانگتے، گھوڑا نہیں مانتے ہم کو تو گدھا چاہیے۔ جاپان میں گدھے نہیں ہوتے۔ یہ گدھا چڑیا گھر میں رکھا جائے گا۔ جاپانی بچے ذوق و شوق سے دیکھیں گے اور پوچھیں گے کہ کہاں پایا جاتا ہے؟ جواب ملے گا پاکستان میں..... اور یوں وہ پاکستان سے روشناس ہوجائیں گے اور یاد رکھیں گے کہ پاکستان بھی ایک ملک ہے، وہ ملک جہاں گدھے پائے جاتے ہیں.....اور افراط سے پائے جاتے ہیں۔

اقوال حضرت علیؓ

بنتِ منیر احمد نیازی، کوٹلہ مغلان

☆ حکمت ایک درخت ہے جو دل میں اُگتا ہے، دماغ میں پَھلتا پھُولتا اور زبان کے ذریعے پھل دیتا ہے۔

☆ بوڑھے کا مشورہ، جوان کی قوتِ بازو سے زیادہ موثر ہے۔

☆ قناعت وہ دولت ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

☆ جو اپنی حیثیت جانتا ہے، اس کی عزت محفوظ رہتی ہے۔

☆ غصہ پینا، گویا دنیا کا سب سے مفید مشروب پینا ہے۔

☆ بہترین تجربہ وہ ہے، جس سے نصیحت حاصل ہو۔

☆ وہی بات ٹھیک ہوتی ہے جو سب کے لیے مفید ہو۔

☆ جو زیادہ بولتے ہیں، زیادہ غلطیاں کرتے ہیں۔

☆ دوست کے دشمن کو دوست نہ بناؤ، اس طرح دوست بھی دشمن ہو جائے گا۔

شبنم کے قطرے

حلیمہ صابر اعوان، ہری پور

☆علم حاصل کریں، کیوں کہ علم ہی کی وجہ سے انسان، انسان بنتا ہے۔

☆عقل مند آدمی وہ ہے، جو کم بولے اور زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

☆ خود کسی کے پیچھے نہ جائیں، بلکہ اپنے آپ میں اتنی اہلیت پیدا کریں کہ لوگ آپ کے پیچھے آئیں۔

☆ والدین وہ گھنی چھاؤں ہیں جن کے سائے میں کھڑے ہو کر آپ اپنے سب دکھ بھول جاتے ہیں۔

☆ صورت بغیر سیرت کے ایسا پھول ہے جس میں کانٹے زیادہ اور خوشبو کم ہو۔

☆ گالی، وہ گولی ہے جو زبان سے چلائی جاتی ہے ،جس کے لگنے سے روح زخمی ہو جاتی ہے۔

☆ جو اونچائی پر کھڑے ہوتے ہیں انھیں آندھیوں کا سامنا زیادہ کرنا پڑتا ہے۔

سنہری باتیں

تحریم خان، شمالی کراچی

☆ بارش میں، میں نے دیکھا کہ جن کے پاس سکے تھے وہ شوق سے بھیگتے رہے اور جن کے پاس نوٹ تھے وہ چھت تلاش کرتے رہے۔

☆ جو شخص تمھاری نگاہوں سے تمھاری ضرورت کو نہ سمجھ سکے اس سے کچھ مانگ کر خود کو شرمندہ مت کرو۔

☆ انسان دکھ نہیں دیتے۔ انسانوں سے وابستہ اُمیدیں دکھ دیتی ہیں۔

☆ مٹی کی پکڑ بہت مضبوط ہوا کرتی ہے سنگِ مرمر پہ تو پاؤں پھسلا ہی کرتے ہیں۔

☆ پیٹھ پیچھے آپ کی بات چلے تو گھبرائیں نہیں، کیوں کہ بات ان ہی کی ہوتی ہے جن میں کوئی بات ہوتی ہے۔

☆ اپنی اصلیت اور حقیقت کی یاد آوری عموماً انسان کو بھٹکنے نہیں دیتی۔

☆ غور و فکر ایک ایسا آئینہ ہے، جو ہمیں ہماری اچھائیاں اور بُرائیاں دکھاتا ہے۔

ڈوڈو

محمد عادل آصف، تلونڈی

یہ پرندہ موریشس نامی ملک سے تعلق رکھتا

تھا، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ پرندہ اُڑنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ دریافت ہونے والی باقیات کے مطابق اس پرندے کا وزن تقریباً ۲۱ کلوگرام تک ہوا کرتا تھا، جب کہ اس کی لمبائی ایک میٹر تک ہوتی تھی۔ اب اس پرندے کی موجودگی ہمیں صرف تصویروں ہی میں دکھائی دیتی ہے۔

مہوڈنڈ جھیل

ارفع زینب چشتی، ڈی جی خان

مہوڈنڈ جھیل وادیٔ سوات کی ایک خوب صورت جھیل ہے۔ کالام سے یہاں تک جیپ کے ذریعے تین سے چار گھنٹے کا راستہ ہے۔ راستے میں اور بہت سے خوب صورت علاقے آتے ہیں۔ راستے میں ایک چشمہ بھی آتا ہے جسے ''چشمۂ شفا'' کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ اس چشمے کا پانی پینے سے بیماری سے شفا ہوتی ہے۔ یہاں سے دوسو کلو میٹر کے فاصلے پر چین واقع ہے۔

جھیل کے قریب پہاڑ کے پیچھے چترال ہے۔ اس جھیل سے تقریباً پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر ایک اور جھیل آتی ہے اس کا نام ''سیف اللہ'' جھیل ہے۔ اس سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ایک پہاڑ ہے جسے ''جاگ برنال'' کہتے ہیں۔ مہوڈنڈ جھیل میں کشتیاں بھی چلتی ہیں۔ اگر بارش ہو تو بارش سے بچنے کے لیے کیمپ موجود ہیں۔ یہ علاقہ غیر آباد نہیں ہے۔ یہاں پر کھانے پینے کا سامان مل جاتا ہے۔ اس علاقے میں ایک گلیشیئر بھی ہے، جس کا نام ''اُشو گلیشیئر'' ہے۔ آپ یہاں پر ضرور آئیں اور قدرت کے حسن کا نظارہ کریں۔

سونا

سیدہ تسبیح محفوظ علی

سونا ایک قیمتی اور کمیاب دھات ہے۔ یہ دھات دنیا میں تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سمندر میں تقریباً دس ہزار ملین ٹن سونا موجود ہے۔ یہ عام طور پر دو شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ خالص حالت میں یا پھر دوسری دھاتوں کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ خالص سونا سیلابی سونا کہلاتا ہے۔ ۱۹۱۶ء تک تمام دنیا کی کرنسی کو سونے سے ناپا جاتا تھا۔ اسے گولڈ اسٹینڈرڈ نظام کہتے تھے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سونا جنوبی افریقا میں پایا جاتا ہے۔

کچی بستی

مسز سلمیٰ عقیل شاہ

ذاکر صاحب نے آنے والے کل کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ جو کمایا، خرچ کر دیا۔ بیگم اور بچے بھی فضول خرچی کے عادی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ ہمیشہ ایسے ہی رہے گا۔ کچھ دن پہلے ذاکر صاحب کی کمپنی کا مالک جعل سازی کے جرم میں پکڑا گیا۔ کمپنی بند ہوگئی اور ملازمین بے روزگار ہو گئے۔

ذاکر صاحب کے خاندان پر بھی بُرا وقت آ گیا۔ ذاکر صاحب کو اب اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد ایک کچی بستی میں ایک چھوٹا سا مکان سستے کرائے پر مل گیا۔ اس کچی بستی کے لوگ بہت ملنسار تھے۔ ایک دوسرے کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں کام آتے تھے،

لیکن ذاکر صاحب کے بیوی بچے یہاں ذرا بھی خوش نہیں تھے۔ وہ یہاں کے لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ خاص طور پر اپنے پڑوسی رمضان سے، کیوں کہ انھوں نے گھر میں گائے اور مرغیاں پالی ہوئی تھیں۔ جانوروں کے شور اور چاروں طرف پھیلی بُو سے وہ پریشان تھے۔

ذاکر صاحب تو کسی حد تک گھل مل گئے تھے، لیکن بیگم بچوں کا مزاج ذرا بھی نہ بدلا۔ ان کے رویے کی وجہ سے محلے کے تمام لوگ ان سے لاتعلق ہوتے چلے گئے۔ ذاکر صاحب کو ایک معمولی نوکری مل گئی تھی۔

ایک رات اچانک زوروں کی بارش شروع ہوئی۔ بارش اس قدر زوردار ہو رہی تھی کہ بستی کے سامنے سے بہتا ہوا نالہ تیزی سے بھرنے لگا۔ سیلاب جیسی کیفیت ہوگئی۔ ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی، جس کی وجہ سے بعض گھروں کی چھتیں بھی اُڑ گئی تھیں۔ بستی والے اپنا ضروری سامان لے کر بستی سے باہر نکلنے لگے تھے۔ ذاکر صاحب کے گھر والوں کو شاید ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی۔

رمضان اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو لے کر اونچائی پر بنے ریلوے اسٹیشن کی طرف نکلا۔ یہاں پانی آنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بستی کے تمام لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بڑے نالے کے بھرنے کی وجہ سے پوری بستی سیلاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ رمضان اور بستی کے دوسرے لوگ بہت پریشان تھے کہ ابھی تک ذاکر صاحب اور ان کے گھر والے نہیں پہنچے۔ رمضان سے آخر رہا نہ گیا۔ وہ فوراً دو تین جوانوں کو لے کر دوبارہ بستی میں پہنچا، تب تک پانی اور بلند ہوگیا۔ رمضان بڑی مشکل سے ذاکر صاحب کے گھر تک پہنچا اور چیخ کر کہا: ''ذاکر بھائی! دروازہ کھولو، پوری بستی خالی ہو چکی ہے۔ سب محفوظ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ آپ لوگ بھی چلیں، پانی تیزی سے بلند ہو رہا ہے۔''

ذاکر صاحب اور ان کی بیگم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کو مچان پر لٹا دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس قسم کے حالات کا سامنا ہوا تھا۔ رمضان اور ان کے ساتھی بچوں کو لے کر باہر نکلے۔

رمضان، ذاکر صاحب کے خاندان کو لے کر ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں پہنچے، جہاں پہلے ہی بستی کے تمام لوگ جمع تھے۔ ان کو دیکھ کر تمام لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بیگم ذاکر کا تو رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ بچے بھی بہت خوف زدہ تھے۔

بستی والوں نے انھیں حوصلہ دیا۔ کپڑے اور اپنا کھانے پینے کا سامان بھی دیا۔ بیگم ذاکر شرمندہ ہو رہی تھیں، کیوں کہ وہ ہمیشہ بستی والوں سے دور رہی تھیں۔ یکا یک انھیں اپنی چھوٹی بیٹی کا خیال آیا، جو نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذاکر صاحب بھی پریشان ہوئے۔ انھیں بھی گھبراہٹ میں اپنی بچی کا خیال ہی نہیں رہا۔ شاید وہ مچان پر سو گئی تھی۔

بستی کے تمام لوگ اس بچی کے لیے پریشان تھے۔ رمضان نے سب کو حوصلہ دیا اور کہا: ''میں بستی میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

ذاکر صاحب نے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تو رمضان نے منع کر دیا اور کہا: ''ذاکر بھائی! پانی کافی بلند ہے۔ خطرہ ہوا میں تو اپنی بھینس پر بیٹھ کر جاؤں گا۔ بس آپ لوگ دعا کریں۔''

رمضان وہاں پہنچا تو بچی مچان پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے فوراً بچی کو اُٹھا لیا۔ رمضان بچی کو لے کر پلیٹ فارم میں پہنچا تو ذاکر صاحب دوڑتے ہوئے رمضان سے اپنی بچی لی اور رمضان کو سینے سے لگا لیا اور تشکر اور ندامت کے احساس سے اس کی آنکھیں بھیگ گئی۔ بچی کو دیکھ کر بیگم ذاکر کی حالت بھی سنبھلی اور وہ ہاتھ اُٹھا کر رمضان کو دعائیں دینے لگیں۔

بیگم ذاکر نے بستی والوں سے اپنے رویے کی معافی مانگ لی۔ پانی اُترا تو بستی پھر سے آباد ہو گئی۔ اب بیگم ذاکر عورتوں میں اور بچے بچوں میں گھل مل گئے۔ ذاکر صاحب کو ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ انھوں نے یہاں سے کسی اور علاقے میں منتقل ہونے کے لیے بیگم سے مشورہ کیا تو بیگم اور بچوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان کی بیگم نے کہا: ''بستی والوں نے جس قدر پیار دیا ہے، وہ کسی اور علاقے میں نہیں مل سکتا۔''

یہ سن کر ذاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور خوش ہو گئے۔

Press ad

Page 68

آنے والا دور

ترجمہ: رباب عائشہ

ہر دور کا انسان ماضی، حال اور مستقبل جاننے کے لیے بے چین رہا ہے۔ مستقبل کے پردے میں کیا چھپا ہے؟ اس کی کھوج انسان کو بے چین کیے رہتی ہے۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے ہی بادشاہ کی ہے جو گزرے ہوئے ہزاروں سال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ کوئی اسے بتا دے کہ اس کے بعد آنے والا دور کیسا ہوگا؟

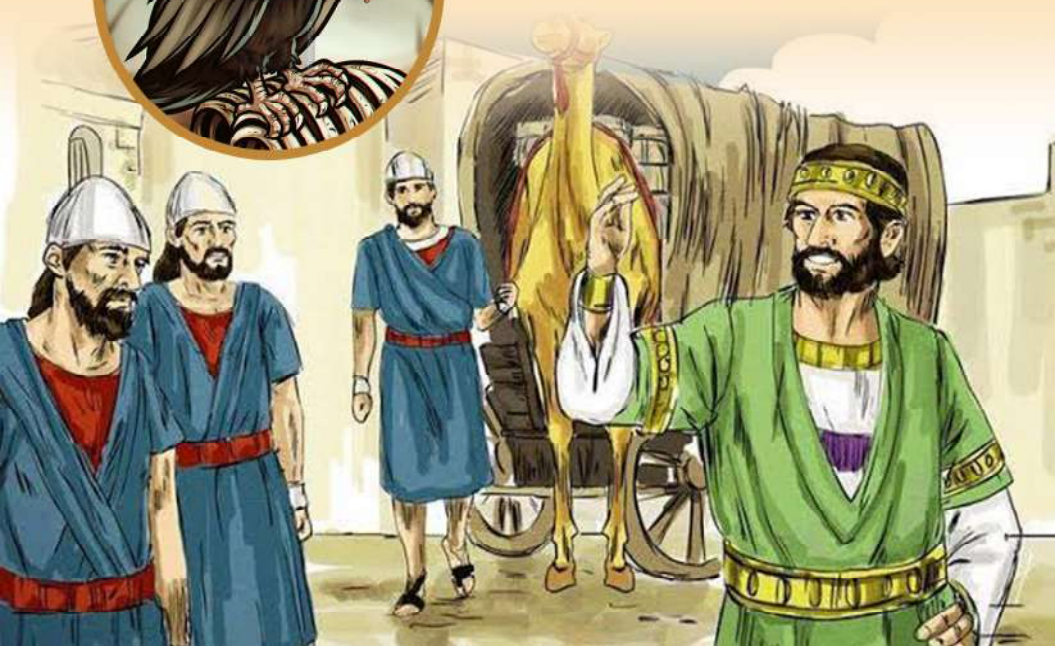

سلیمان بادشاہ کے دل میں یہ تمنا کیسے جاگی۔ ہوا یوں کہ اللہ میاں نے موت کے فرشتے عزرائیل کو بادشاہ کی جان لینے کے لیے بھیجا۔ بادشاہ کوئی معمولی انسان نہیں تھا۔ وہ نہایت عقل منداور دانش مند تھا۔ عزرائیل نے جب اسے بتایا کہ وہ اس کی جان لینے آیا ہے تو بادشاہ نے کہا کہ میں تمھاری بات مان سکتا ہوں، لیکن پہلے مجھے یہ بتایا جائے کہ میرے بعد آنے والا حکمران کیسا ہوگا۔ میں نے پانچ سو سال حکومت کی ہے مجھے یہ فکر ہے کہ میرے بعد میری رعایا کس حال میں ہوگی۔

عزرائیل نے واپس جاکر جب یہ بات اللہ میاں سے کہی تو اللہ تعالیٰ نے کہا چلو ہم بادشاہ کو چالیس دن کی اور مہلت دیتے ہیں، لیکن تم اس سے جاکر کہو کہ ان چالیس دنوں میں وہ یہ معلوم کرے کہ ماضی میں دنیا کیسی تھی۔ اگر اس نے یہ معلوم کرلیا تو اس کا موجودہ دور سے مقابلہ کرنے کے بعد اس کی خواہش ہوگی کہ وہ اس دنیا میں مزید نہ رہے۔

عزرائیل نے واپس آکر بادشاہ کو اللہ میاں کا پیغام پہنچادیا۔ بادشاہ نے اپنے مشیروں سے پوچھا: ''دنیا میں کس جانور نے سب سے لمبی عمر پائی ہے۔''

مشیروں نے کہا کہ وہ سفید گدھ جو اک بابا کے نام سے مشہور ہے۔ دنیا کا سب سے پرانا پرندہ ہے۔ بادشاہ اس سفید گدھ کے پاس گیا اور کہا: ''میں دنیا میں پانچ سو سال سے حکومت کررہا ہوں اب مجھے صرف چالیس دن کی زندگی اور ملی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ ماضی میں یہ دنیا کیسی تھی؟''

گدھ نے کہا: ''میری عمر تو صرف پندرہ سو سال ہے بہتر ہے کہ تم اس پہاڑ کی دوسری جانب رہنے والے میرے بھائی سے مل لو جو دو ہزار سال سے زندہ ہے۔''

بادشاہ پہاڑی کی دوسری طرف جاکر اس بوڑھے گدھ سے ملا۔ گدھ نے کہا: ''میں تمھیں اپنے تجربات بتاتا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ایک دفعہ بہت شدید برف باری ہوئی۔ کھانے پینے کی تمام چیزیں برف کے نیچے دب گئیں۔ مجھے کئی دن تک کھانے کو کچھ نہ ملا تو بھوک سے نڈھال

ہوگیا۔خوراک کی تلاش میں اِدھراُدھر پھر رہا تھا کہ سونے کا ایک مینار نظر آیا۔میں مینار کے اوپر بیٹھ گیا۔میری نظر مینار سے نیچے پڑی تو دیکھا لوگ نماز پڑھنے میں مصروف ہیں۔پہلی قطار میں سفید ڈاڑھیوں والے لوگ بیٹھے ہیں، دوسری قطار میں جو لوگ تھے ان کی داڑھیاں کالی تھیں اور سب سے پچھلے والے کلین شیو تھے۔نماز ختم ہونے کے بعد جب چند لوگوں نے دیکھا کہ میں اوپر نڈھال پڑا ہوں تو ایک بزرگ نے کہا:''یہ پرندہ بھوک سے مر رہا ہے، چلو ایک بیل ذبح کرتے ہیں اور اس کو کھانے کو کچھ دیتے ہیں۔ان نیک لوگوں نے ایسا ہی کیا میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا اور میرے جسم میں توانائی آ گئی۔سو سال بعد پھر ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا شدید سردی اور برفباری کی وجہ سے مجھے کو کچھ نہیں ملا۔میں پھر مسجد کے ایک مینار پر جا بیٹھا یہ مینار چاندی کا تھا اور اس مسجد میں بھی لوگ نماز ادا کر رہے تھے۔میں نے دیکھا کہ یہاں پہلی قطار میں کالی داڑھیوں والے تھے۔ان کے پیچھے سفید داڑھی والے اور آخر میں وہ لوگ تھے جن کی داڑھیاں نہیں تھیں۔ایک بار پھر پہلے کی طرح ہوا۔نمازیوں نے جب مجھے بھوک سے نڈھال دیکھا تو انھوں نے کہا چلو ایک بھیڑ ذبح کر کے اس کو کھانے کو کچھ دے دیتے ہیں۔انھوں نے ایسا ہی کیا۔میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔اس واقعہ کے بعد پھر جب سو سال اور گزرے تو ایک بار پھر برف کا طوفان آیا۔مجھے کئی دن تک کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا میں سوچا کیوں نہ کسی مسجد کے مینار پر جا بیٹھوں ،اس طرح پیٹ بھرنے کا سامان تو ہو ہی جائے گا۔اس بار جب میں مسجد کے مینار پر جا کر بیٹھا تو مجھے پتا چلا کہ یہ مینار نہ تو سونے کا ہے نہ چاندی کا بلکہ یہ تانبے کا بنا ہوا ہے۔اب جو لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، ان میں سے بغیر داڑھیوں والے سب سے آگے تھے۔اس کے پیچھے سیاہ داڑھیوں والے تھے اور سب سے پیچھے سفید داڑھیوں والوں کو جگہ ملی تھی۔میں اب بھی پُر اُمید تھا کہ شاید کھانے کو کچھ مل جائے۔اچانک میرے کانوں میں باتیں کرنے والے دو آدمیوں کی آواز

پڑی۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ وہ دیکھو ایک پرندہ مینار پر بیٹھا ہے ذرا بھاگ کر میری بندوق تو لے آؤ اسے مار کر ایک وقت کا کھانا تو بن جائے گا۔ میں نے سنا تو بھاگ کھڑا ہوا۔''

گدھ نے بادشاہ سے کہا: ''دنیا روز بروز زوال کی طرف گامزن ہوتی جا رہی ہے، تہذیب وتمدن منٹ گیا ہے۔ لوگوں کے دل چھوٹے ہو گئے ہیں۔ خودغرضی اور لالچ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لوگ خیرات دینے میں بھی کنجوسی کرتے ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ ان حالات میں تمھارے بعد آنے والا حکمران پارسا اور متقی ہوگا۔''

بادشاہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ آنے والا وقت گزرے ہوئے زمانے کے مقابلے میں تکلیف دہ ہی ہوگا، اس لیے دنیا میں مزید رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر اس نے اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا۔

فٹ بال سازی

نسرین شاہین

دنیا کے سب سے مقبول کھیل فٹ بال میں استعمال ہونے والی ۵۰ فی صد گیندیں پاکستان میں بنتی ہیں۔ پاکستان سے برآمد کی جانے والی کھیلوں کی اشیاء میں فٹ بال پہلے نمبر پر ہے۔ اس کے بعد ہاکی، کرکٹ کے بلے اور کرکٹ کی گیندیں برآمد کی جاتی ہیں۔ کھیلوں کا سامان تیار کرنے میں پاکستان کے شہر سیالکوٹ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

سیالکوٹ میں ہاتھ سے فٹ بال سینے کی روایت ایک صدی سے زیادہ پرانی ہے۔ یہاں ہر سال تقریباً ۴۰ ملین (چار کروڑ) فٹ بال تیار کیے جاتے ہیں۔ نائیکی (NIKE) اور اڈیڈیس (ADIDAS) جیسے فٹ بال کے مشہور عالمی برانڈ بنانے والی کمپنیوں کے ۸۰ فی صد فٹ بال یہاں تیار ہوتے ہیں۔

سیال کوٹ میں اس صنعت کے آغاز کی رکارڈ شدہ تاریخ ۱۸۹۵ء ہے، جب یہ شہر ٹینس ریکٹس کی

تیاری میں شہرت حاصل کرنے لگا۔ سیالکوٹ میں فٹ بال کی صنعت کے حوالے سے بھی اسی سے ملتی جلتی روایت بیان کی جاتی ہے۔ جس میں ٹینس ریکٹ کی جگہ فٹ بال لے لیتا ہے۔

اس روایت کے مطابق لگ بھگ ایک صدی قبل ایک برطانوی فوجی افسر سیالکوٹ کے دورے پر آیا۔ جہاں اس کا فٹ بال پھٹ گیا۔ وہ ایک کاری گر کے پاس گیا۔ جس نے یہ فٹ بال بہت اچھے طریقے سے مرمت کر دیا۔ بعد میں یہ کاری گر خود ہی فٹ بال تیار کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کام سیالکوٹ میں ایک صنعت کی شکل اختیار کر گیا۔

سعید نامی اس کاری گر کے نام سے آج بھی سیالکوٹ میں ایک سڑک موجود ہے۔ یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے جب ایک مقامی کارخانے دار کو برطانوی فوج کے لیے فٹ بالز کی سپلائی پر برٹش ایمپائر ایکسپورٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد سے سیالکوٹ میں فٹ بال سازی کی صنعت زور پکڑ گئی اور آج اس صنعت کے حوالے سے سیالکوٹ کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔

سیالکوٹ کی شہرت اس وقت پوری دنیا میں پھیل گئی جب یہاں تیار کیا جانے والا ٹینگو فٹ بال ۱۹۸۲ء کے فیفا ورلڈ کپ میں استعمال ہوا۔ اس سے پہلے اڈیڈس کا تیار کردہ ٹینگو فٹ بال ۱۹۷۸ء کے ارجنٹائن ورلڈ کپ میں استعمال ہو چکا تھا، تاہم اگلے ورلڈ کپ میں سیالکوٹ میں تیار ہونے والا ٹینگو فٹ بال زیادہ اچھے معیار کا تھا۔ ٹینگو فٹ بال میں بیس ایک جیسی ٹکڑیاں ہوتی ہیں، جنھیں اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ فٹ بال پر بارہ دائروں جیسی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کل سیالکوٹ میں ہاتھ سے تیار کردہ فٹ بال کو تھائی لینڈ اور چین میں مشین سے تیار ہونے والے فٹ بالوں سے سخت مقابلے کا سامنا ہے۔

۲۰۰۶ء میں جرمنی میں ہونے والے فٹ بال ورلڈ کپ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس میں پاکستانی فٹ بال کے بجائے تھائی لینڈ کا بنا ہوا فٹ بال استعمال کیا گیا تھا۔ جب کہ جنوبی افریقا میں ہونے والے ۲۰۱۰ء کے ورلڈ کپ میں چین کا تیار کردہ فٹ بال استعمال کیا گیا، تاہم ان سب باتوں کے باوجود ہاتھ سے بنے ہوئے فٹ بال کی طلب میں کمی نہ آئی، کیوں کہ ان فٹ بالوں کا معیار مشین پر تیار ہونے والے فٹ بالوں سے بہتر ہوتا ہے۔

سیالکوٹ میں فٹ بال کی سلائی کے مراکز موجود ہیں۔ ان مراکز کو ٹھیکے دار اپنے کاری گروں سے بنواتے

ہیں۔شہر کے علاقے پکی کوٹلی میں قائم ''فٹ بال سلائی سینٹر'' کافی شہرت رکھتا ہے۔ جہاں فٹ بال، بیس بال اور دیگر اقسام کی گیندیں تیار ہوتی ہیں۔ فٹ بال کی تیاری کے لیے پہلے مرحلے میں لیٹکس (Latex) گلو سے کپڑے کی دو یا تین تہیں لگائی جاتی ہیں۔اس مرحلے کو لیمینیشن کہتے ہیں۔اس میں جو کپڑا استعمال ہوتا ہے وہ مختلف معیار کا ہوتا ہے اس طریقہ کار کے بعد لیٹکس کو سوکھنے کے لیے لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس کو سوکھنے میں آٹھ تا دس گھنٹے لگتے ہیں۔اس کے بعد مشین کے ذریعے لیٹکس کی کٹنگ ہوتی ہے۔ پھر اسکرین پرنٹنگ کی جاتی ہے۔لکڑی کے فریم والی چھوٹی چھوٹی اسکرینز سے ایسے ٹکڑوں پر مختلف ڈیزائن کی پرنٹنگ ہوتی ہے۔ یہ مرحلہ دیکھنے میں خاصا دل چسپ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کام کیمیکل اور رنگوں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔فٹ بال کے لیے چمڑے کے ٹکڑے فیکٹریوں میں تیار کیے جاتے ہیں اور سلائی سینٹروں میں بھجوا دیے جاتے ہیں۔۱۸ پینل والی فٹ بال کے لیے ۱۸ ٹکڑے گن کر رکھ دیے جاتے ہیں۔اسی طرح ۲۴ یا ۳۲ پینل والی فٹ بالوں کے لیے اتنے ہی ٹکڑے گن کر رکھ دیے جاتے ہیں۔اب یہ ٹکڑے سلائی پر جانے کے لیے تیار ہیں۔سلائی کا مرحلہ سب سے زیادہ محنت اور توجہ کا حامل ہوتا ہے۔

کمپنی کے آرڈر اور خواہش کے مطابق فٹ بال تیار کیے جاتے ہیں کہ ہوا بھرنے کے بعد اس کا کتنا وزن ہونا چاہیے۔بعض کمپنیاں بلیڈر (Bladder) ساتھ سی کر دیتی ہیں، ورنہ پھر سلائی کرنے والے کاری گر کو سلائی کے ساتھ انھیں سینا ہوتا ہے۔ بلیڈر وہ ہوتا ہے، جس میں ہوا بھری جاتی ہے۔ اس سے بال کا اُچھلنا بہتر ہو جاتا ہے اور اس کی گولائی بھی برقرار رہتی ہے۔سلائی کے بعد فٹ بال میں ہوا بھری جاتی ہے، لیکن پہلے سپر وائزر فٹ بال کو چیک کرتے ہیں۔اگر کوئی نقص ہو تو اس پر سرخ پنسل سے نشان لگا کر نقص بتا دیا جاتا ہے اور اگر کوئی نقص نہ ہو تو اس پر اسٹیکر لگا دیتے ہیں۔فٹ بال کی سلائی جس دھاگے سے کی جاتی ہے، وہ خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے، جس سے اُنگلیاں کٹنے کا خطرہ ہوتا ہے، اس لیے سلائی کرنے والے کاریگر اپنی اُنگلیوں پر دھاتی خول پہن لیتے ہیں۔سیالکوٹ میں ہاتھ سے بنے فٹ بال کے سو سے زائد سلائی مراکز ہیں۔ وطنِ عزیز پاکستان کے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ فٹ بال کے سب سے بڑے مقابلے فیفا میں پاکستان کی بنی فٹ بال استعمال کی جاتی ہے۔

دریا کے پار جانا

تنویر انجم

کتنی حسیں ہے دیکھو
کاغان کی یہ وادی
کہسار چار جانب
پیڑوں کے سائے اوڑھے
کس شان سے کھڑے ہیں
یہ سبز رنگ ان کا
آنکھوں کو دے طراوت
دل میں بھرے حلاوت

دامن میں بہ رہا ہے
کنہار یہ سریلا
پتھریلے راستے پر
پانی چلا ہے گاتا
آگے ہے اس کے نیلم
یہ اس سے جا ملے گا
پھر دونوں اک جگہ پر
جہلم میں جا گریں گے

کنہار کے کنارے
اونچی پہاڑیوں پر
کچھ نیچے اور کچھ اوپر
پیڑوں کے جمگھٹوں میں
آدھے چھپے مکاں ہیں
کچھ کچے کچھ ہیں پکے
ہیں لوگ ان میں بستے
اونچی پہاڑیوں پر
آرام سے ہیں چڑھتے
دریا کو پار کرنا
مشکل نہیں ہے کچھ بھی
پل ہیں کہیں کہیں پر
ورنہ ہے ایک رسی
اس پر لگی ہے چرخی
جس سے بندھی ہے کرسی
دریا کے پار اس کو
بچے دھکیلتے ہیں
کنہار کے کنارے
چلتی ہوئی سڑک پر
لوگوں کے ان گھروں کے
نزدیک سے جو گزرو
کچھ دیر ٹھہر جانا
دریا کے پار جانا
لوگوں سے مل کے آنا

نونہال خبرنامہ

خرم فرخی

کماؤ پوت

نئے زمانے کی نئی ٹیکنالوجی سے بہت سے لوگ دولت کما رہے ہیں۔ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچے بھی رقم کمانے میں پیچھے نہیں ہیں۔ یوٹیوب پر کم عمر بچوں میں سب سے زیادہ کمائی کرنے والا امریکی بچہ سات سالہ ریان ہے، جس کی سالانہ آمدنی ڈھائی ارب روپے ہے۔ اب جنوبی کوریا کی چھے سالہ بچی ''بورام'' سامنے آئی ہے۔ یہ بچی چھوٹے بچوں کے لیے مزاحیہ ویڈیوز بنا کر یوٹیوب پر لوڈ کرتی ہے۔ بورام نے ۸۰ لاکھ ڈالر (پاکستانی ایک ارب روپے) کما کر ایک پانچ منزلہ عمارت خریدی ہے۔ بورام کے یوٹیوب پر دو چینلز موجود ہیں۔

وفادار بلی

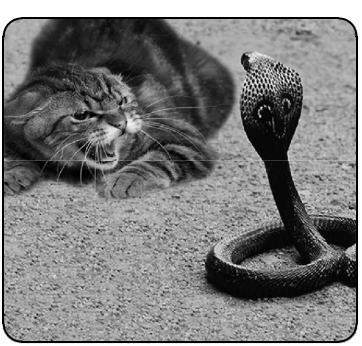

جانوروں کو اگر محبت سے پالا جائے تو وہ بھی اپنی محبت وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔ بھارت میں ایک پالتو نے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے زہریلے سانپ کو مار بھگایا۔ بلی نے باقاعدہ مقابلہ کر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اسے بھاگ نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں نے بلی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آج کل انسان سے زیادہ جانور وفادار ہیں۔

لومڑی ہمت والی

مہم جوصرف انسان ہی نہیں، جانور بھی ہوتے ہیں۔ناروے کے ''پولرانسٹی ٹیوٹ'' میں موجود محققین نے ایک مادہ برفانی لومڑی کے سفر کا جائزہ لینے کے لیے اس پر ''جی پی ایس ٹریکر'' لگا کر آزاد چھوڑ دیا۔ یہ لومڑی غذا کی تلاش میں مغرب کی طرف روانہ ہوئی۔اس نے گرین لینڈ تک کا ۱۵۱۲ کلومیٹر کا فاصلہ ۲۱ دن میں طے کیا۔ اس لومڑی کی عمر صرف ایک سال ہے۔ اس کم عمر لومڑی نے ناروے سے شمالی کینیڈا تک ۳۵۰۶ کلومیٹر کا فاصلہ ۷۶ دنوں میں طے کیا۔ اس لومڑی کی ہمت پر سائنس دان حیران رہ گئے۔

انڈوں کی باتیں

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔قدرت کے رازوں کو اللہ میاں ہی جانتے ہیں۔ پھر بھی انسان تندہی سے ان رازوں پر سے پردہ اُٹھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔حال ہی میں انکشاف ہوا ہے کہ پرندوں کے بچے انڈوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے بہن بھائیوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔یہاں تک وہ والدین کی خبردار کرنے والی صدائیں بھی سنتے ہیں، جو ان کی جان بچانے میں آتی ہیں۔ یہ بات سائنس دانوں کے لیے بھی بہت حیرت انگیز ہے۔

گھوڑے کا سودا

شکیل صدیقی

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ محلّہ صوفی کے خواجہ سعد اللہ کے پاس یوں تو کافی گھوڑے اور گائے بھینسیں تھیں، جنھیں وہ بیچ چکے تھے۔ اب صرف ایک گھوڑا رہ گیا تھا، جسے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ اس کی فروخت کے لیے انھوں نے خاص خاص لوگوں سے کہہ رکھا تھا، تاکہ معزز افراد آ کر سودے بازی کر سکیں۔

مشہور مصنف اے۔ حمید کے والد چودھری صاحب کے پاس رئیسی ٹانگہ تھا۔ جس میں ان کے اہلِ خانہ سوار ہو کر سیر کرتے تھے، لیکن گھوڑا انہیں تھا کہ جس پر وہ تنِ تنہا بیٹھ کر لوگوں پر رعب

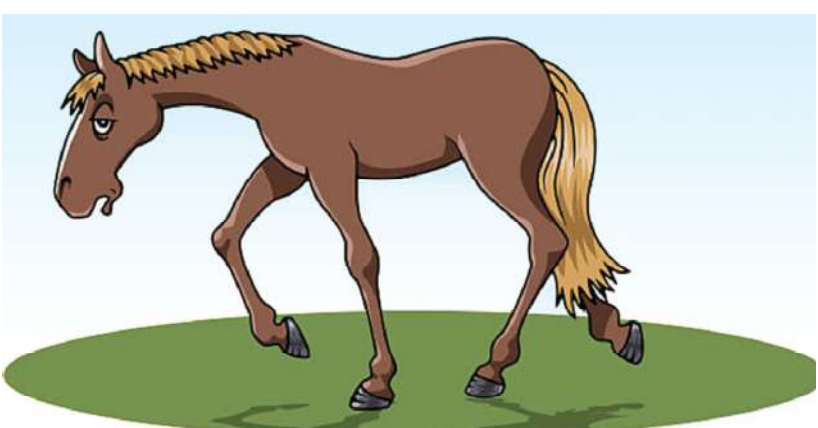

جماتے۔ چناں چہ انھوں نے سوچا خواجہ صاحب کا گھوڑا خرید لیتے ہیں۔ یہ بات انھیں اپنے ایک ملازم سے معلوم ہوئی تھی۔ پہلے زمانے میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ معزز افراد اپنی چیزیں فروخت کریں۔ وہ ایک روز دو تین افراد کو لے کر خواجہ صاحب کی حویلی پر پہنچ گئے۔

ملازم اللہ رکھا انھیں جانتا تھا۔ اس نے پانچ چھے مونڈھے حویلی سے لاکر درختوں کے سائے میں رکھ دیے۔ پھر وہ خواجہ صاحب کو خبر کرنے چلا گیا۔ وہاں ایک گھوڑا بیری کے درخت کے نیچے کھڑا دکھائی دیا۔ دور سے یہ لگا کہ گھوڑے کا ایکسرے لے کر اسے وہاں لٹکا دیا گیا ہے۔ یعنی اس کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں، جو چاہتا انھیں گن سکتا تھا۔ چودھری صاحب اس کے پاس گئے، تاکہ اس کا جائزہ لے سکیں۔ پتا چلا کہ گھوڑے کی کمر میں رسی ڈال کر درخت کی شاخ سے باندھ دی گئی ہے۔

چودھری صاحب نے سوال کیا: ''اس کی کمر میں رسی کیوں باندھی گئی ہے؟''

ایک ملازم نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا: ''جناب! اگر رسی کھول دی گئی تو گھوڑا گر پڑے گا۔ یہ سہارے کے لیے ہے۔''

چودھری صاحب اس کی بات بالکل نہیں سمجھے۔ اگر سمجھ گئے ہوں تو انھوں نے بات نظر انداز کر دی، اس لیے کہ انھوں نے نہ تو کسی سے سنا تھا اور نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ گھوڑے کی کمر میں رسی باندھی جاتی ہے، تب وہ کھڑے ہو پاتے ہیں۔

خواجہ سعد اللہ صاحب کو بلایا گیا، تاکہ قیمت پر بات چیت شروع ہو سکے۔ خواجہ صاحب حقّہ گڑگڑاتے ہوئے باہر آئے اور انھوں نے گرم جوشی سے چودھری صاحب سے مصافحہ کیا۔ وہ اچھے موڈ میں تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور ٹھنڈی ہوا چلنے سے موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ خواجہ سعد اللہ نے اپنی کوٹھی کے آنگن میں برگد کے درخت لگوائے ہوئے تھے، اس لیے سایہ تھا۔ خواجہ صاحب نے ملازم کو حکم دیا کہ لسی بنا کر لائے۔ دونوں طرف کے آدمی ملا کر چھے افراد

تھے، اس لیے ملازم تھوڑی سی دیر میں چھے گلاس لسی بنا کر لے آیا۔

چودھری صاحب نے بات شروع کی: ''خواجہ صاحب! میں آپ کا گھوڑا خریدنے آیا ہوں۔ کیا دام ہوں گے اس کے؟''

''یہ ملک تقسیم ہونے سے کافی پہلے کا واقعہ ہے، جب دھیلے اور کوڑیاں چلا کرتے تھے، یعنی ایک پیسے کی بھی قدر و قیمت تھی۔''

''پانچ روپے۔'' خواجہ صاحب نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''پانچ روپے میں تو اونٹ مل جاتا ہے۔'' چودھری صاحب نے چونک کر کہا اور گھوڑے کو جا کر ایک بار پھر نزدیک سے دیکھا: ''ہمارے آپس کے تعلقات تو کافی پرانے ہیں۔ اس کا لحاظ تو کیجیے۔''

خواجہ صاحب کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ حویلی کے اندرونی دروازہ کھلا اور دو بچے وہاں شور مچاتے ہوئے آ گئے۔ وہ دونوں خواجہ صاحب کے پوتے تھے۔ شوخ اور شرارتی۔ ایک کی عمر پانچ برس اور دوسرے کی تین برس تھی۔ بڑا لڑکا جس کا نام وحید تھا، ان کی گود میں سوار ہو گیا: ''دادا! کیا آپ اسے بیچ رہے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں بیٹا!'' خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ ''کیوں؟''

''اسے بیچ ہی دیں، اس لیے کہ یہ گھوڑا نہیں گدھا ہے۔''

چودھری صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ لسی انھیں بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' خواجہ صاحب نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''گھوڑا گدھا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ گدھے پن کی حرکتیں کرتا ہے۔'' ننھے وحید نے کہا: ''میں اس سے اِدھر چلنے کو کہتا ہوں تو یہ اُدھر چلنے لگتا ہے۔ چلتا ہے، دوڑنا تو اسے آتا ہی نہیں۔''

''بس چپ رہو۔ یہ تمھاری بات نہیں سمجھا ہو گا۔'' خواجہ صاحب نے اسے ڈانٹا۔

''خواجہ صاحب! یہ اتنا کم زور کیوں ہے؟'' چودھری صاحب نے سوال کیا۔
''ارے بھئی! ہماری حویلی کے نزدیک ایک مسجد ہے۔ وہ وعظ وغیرہ غور سے سنتا ہے۔ چناں چہ اس نے پچھلے ماہ روزے بھی رکھ لیے تھے، اس لیے اس کی طبیعت ڈھیلی ہوگئی۔'' انھوں نے بہانہ بنایا۔
چودھری صاحب ''ہوں'' کر کے رہ گئے۔ ''میں اسے بادام پستے اور کشمش کھلاؤں گا تو طاقت ور ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے آپ مناسب دام تو بتایئے۔''
خواجہ صاحب نے چار روپے اور پھر تین روپے کہے، لیکن چودھری صاحب راضی نہیں ہوئے۔
بہر حال سودا ایک روپے بارہ آنے پر ہوگیا۔ چودھری صاحب نے گھوڑا خرید لیا۔
اسے درخت سے کھولنے لگے تو خواجہ صاحب کا ملازم اللہ رکھا نزدیک جا کر بولا: ''حضور! ایسے نہیں۔''
''تو پھر کیسے؟'' چودھری صاحب نے پوچھا۔
''تانگے میں جوت کر لے جائیں۔'' اس نے جواب دیا۔
اس گھوڑے کو تانگے میں جوتا گیا۔ خواجہ صاحب کے ملازم اللہ رکھا نے پھر گھوڑے کی رسی کھول دی۔ وہ کانپا، جھرجھری سی لی اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مجبوراً چودھری صاحب اسے ریڑھی پر ڈال کر اپنی حویلی پر لے آئے اور اپنے ملازم رب نواز کو ہدایت دینے لگے کہ اسے صبح سے شام تک چارے کے علاوہ بادام پستے اور کشمش بھی کھلائی جائے، تاکہ یہ ایک ہفتے میں طاقت ور ہو جائے۔ پھر وہ اس پر سوار ہو کر قصبے میں گھومتے پھریں۔
پتا نہیں کیا ہوا کہ رات کو گھوڑا مر گیا۔ چودھری صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ ان کے سارے خواب چکنا چُور ہو گئے۔ انھوں نے رب نواز کو حکم دیا کہ گھوڑے کو گلی میں پھینک دیا جائے۔ رب نواز نے ایسا ہی کیا۔
صبح کارپوریشن والے آئے اور انھوں نے مردہ گھوڑا وہاں دیکھ کر چالان کر دیا۔ گھوڑا ایک روپیہ بارہ آنے کا تھا اور میونسپلٹی نے پچاس روپے کا چالان کر دیا تھا۔

ہمارا کارنامہ

علی حیدر

ابھی ہم اپنے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے کہ اچانک ہمارے اوپر سے رضائی کھینچ لی گئی۔ سرد ہوا کی لہروں نے جب ہمارے کانوں کو چھوا تو ہم ہڑ بڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ آنکھوں میں نیند اب بھی باقی تھی اور آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں۔ دیکھا تو سامنے بڑے سے منھ پر چوڑی چوڑی مونچھوں والا کوئی شخص ہمیں گھور رہا تھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے کہ جب کہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

یہ شخص تو کسی ایلین کی طرح لگ رہا ہے، جسے ہم نے تھوڑی دیر پہلے اپنی کمال ہوشیاری اور بہادری سے اس کے جہاز سمیت تباہ کر دیا تھا۔'' ہم نے دل میں سوچا اور نعرہ لگایا: ''وہ مارا.....'' اور پھر تکیے پر سر رکھ کر چاروں خانے چت ہو کر پڑ گئے۔ دوسرے ہی لمحے ہمارے منہ پر ایک زوردار تھپڑ کسی ناگہانی آفت کی طرح پڑا۔ ہم ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھے۔ وہ چوڑی چوڑی مونچھوں والا ایلین تو ہمارے ابا ہی تھے۔

''شرم نہیں آتی، میں تمھیں کتنی دیر سے اُٹھا رہا ہوں اور تم ہوش میں ہی نہیں آ رہے۔'' ابا جان کے لہجے میں غصہ تھا: ''برخوردار! جو بہادر مرد ہوتے ہیں ناں، وہ دیر سے نہیں سویرے اُٹھتے ہیں۔''

''ابا جان! آپ تو خود روزانہ گیارہ بجے اُٹھتے ہیں۔'' ہمارے منہ سے نکل گیا۔

ابا جان کچھ جھنجلا گئے: ''اپنے بھیا سے کچھ سیکھو، آج تمھیں شہر جانا ہے، وہ تیار بھی ہو چکا ہوگا اور تم ابھی پڑے سو رہے ہو۔'' ابا جان نے کڑک آواز میں کہا۔

ہم نے ابا جان کی پُشت کی جانب موجود بھائی جان کی چارپائی کی طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ وہ بستر میں منہ پر اُنگلی رکھے مجھے خاموشی کا اشارہ کر رہے تھے۔

''چلو جلدی کرو، تیار ہو جاؤ۔ تمھیں وہاں آج ہی پہنچنا ہے۔'' ابا جان نے کہا اور چلے گئے۔

ہم جلدی جلدی تیار ہوئے، آج ہمیں ابا جان نے یہ کام سونپا تھا کہ کچھ سامان ہمیں شہر میں خالہ نظیراں کے ہاں پہنچانا تھا۔ ویسے تو ہم اکیلے بھی جا سکتے تھے، لیکن ابا جان کو بھائی جان پر کچھ زیادہ ہی اعتماد تھا، سو وہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بھائی کے منہ پر ٹھنڈے پانی کا جگ اُلٹا کر انھیں اُٹھایا تو وہ غصہ ہو گئے، لیکن فوراً ہی اس دھمکی پر نرم ہو گئے کہ ابا جان کے لیے ان کی خالہ نے جو دیسی گھی کے لڈو بھیجے تھے، ان کی تعداد کم کرنے میں بھائی جان ملوث ہیں۔ اس بارے میں ہم ابا جان تک اطلاع پہنچا دیں گے۔ یہ سن کر بھائی جان چوکنا ہو کر تیار ہونے چلے گئے۔ اماں کھانا بنا چکی تھیں۔ ہم باتھ روم سے باہر آئے تو بھائی جان کھانا کھا چکے تھے۔ ابھی ہم کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ ابا

جان موت کے فرشتے کی طرح اچانک پہنچ گئے: ''تم ابھی تک کھانا ہی کھا رہے ہو تو پھر وہاں پہنچو گے کب؟ اگر پہلی بس چھوٹ گئی تو پھر دوسری بس دو پہر کے وقت ہی ملے گی۔'' ابا جان نے کہا۔

''لیکن کھانا تو کھانے دیں اسے، بچہ ہی ہے، سامان بھی پہنچ جائے گا خالہ کے گھر۔'' اماں نے روایتی انداز میں ہماری طرف داری کی۔

ابا نے کہا: ''ارے ابھی تک کیا بچہ ہی ہے! اتنا بڑا تو ہو گیا ہے، خالہ نظیراں کے گھر جا کر ہی کھالے گا۔''

پھر ہم سے مخاطب ہوئے: ''ارے بہادر بچو! ہمارا دادا کے پڑ دادا تو تین تین دنوں تک بغیر کچھ کھائے پیے مشقت کرتے رہے تھے۔''

پھر ہمیں ان کی شجاعت اور ہمت کے ایسے ایسے قصے سنائے کہ ہمارے رگوں میں بھی بہادری کا جوش ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ہم نے کھانے کو وہیں چھوڑا اور سامان والا تھیلا اُٹھایا اور گھر سے نکل گئے۔ نکلنے سے پہلے اماں نے ہماری اور بھائی جان کی خوب نظر اُتاری۔ لاری اڈے پر پہنچ کر ہم دونوں بس کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے ایک گھنٹے بعد بس آئی تو اتنی بھری ہوئی تھی کہ لوگ دونوں طرف دروازوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ہماری سانس راستے میں رک گئی: ''تو کیا ہمیں بھی ایسے ہی لٹک کر جانا پڑے گا۔'' ہم نے بہ مشکل تھوک نگلا۔

''ارے تم ڈر گئے کیا، ہمت رکھو، ابھی تو بس اور بھرے گی۔'' بھائی جان نے مزید ڈرا دیا۔ بھائی جان نمونے کے طور پر بس پر پہلے سوار ہو گئے کہ ہمیں کس طرح لٹکنا ہے، لیکن تب تک بس چل چکی تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارا رنگ اُڑ گیا اور ہم فوراً بس کے پیچھے بھاگے، بس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور ہم اس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے۔ بھائی جان ایک ٹانگ اور ہاتھ پر لٹک کر ایک ہاتھ ہماری طرف بڑھائے ہوئے تھے۔ آخر بھائی جان کے ہاتھ کی جگہ بس کا ڈنڈا ہمارے ہاتھ

آ گیا۔ ہم فوراً اُچھل کر بس پر سوار ہو گئے ۔آخر جان میں جان آئی، لیکن سامان کے وزن اور بھاگ بھاگ کر ہماری ٹانگیں بہت تھک چکی تھیں، لیکن ابھی تو ہمیں بہت دور تک لٹک کر ہی جانا تھا۔آخر کچھ دور جا کر بس سے کچھ سواریاں اُتریں تو ہم فوراً بس کے اندر پہنچے۔ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں ۔ بھائی جان بھی ایک سیٹ پر ٹِک چکے تھے۔آخر ہماری نظر ایک تقریباً خالی سیٹ پر پڑی ، کیوں کہ اسے مکمل خالی کہنا غلط ہوگا۔اس سیٹ پر ایک ضرورت سے زیادہ صحت مند شخص دونوں سیٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔اس کی بڑھی ہوئی توند اگلی سیٹ کی پُشت کو چھو رہی تھی۔ہم اس کے پاس پہنچے اور کہا: ''ذرا سی جگہ دے دیں، ہم یہاں بیٹھنا چاہتے ہیں۔''

تو وہ شخص ہمیں ایسے گھورنے لگا جیسے ہم نے اس سے دیا ہوا اُدھار واپس مانگ لیا ہو۔پھر اس نے جگہ دینے کی اداکاری کی ،لیکن اب بھی وہ پہلی جگہ پر ہی قائم تھا۔خیر ہم نے اپنے غصے کو چھپایا اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی تھوڑی سی جگہ پر قناعت کر کے بیٹھ گئے ۔آخر ٹانگوں کو کچھ سکون ملا۔ تب تک بس پھر بھر چکی تھی ،لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ شخص سگرٹ کے کش لگانے لگا۔ سگرٹ سے ہمیں سخت الرجی تھی۔اس کا دھواں جو ہمارے نتھنوں تک چڑھا تو ہمیں قے سی محسوس ہونے لگا۔آخر اس اذیت سے بچنے کے لیے ہم اس سیٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ہمارے اُٹھنے کی دیر تھی کہ بس میں موجود سواریاں اس سیٹ پر ایسے جھپٹیں جیسے بلی چھچھڑوں پر جھپٹتی ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم شہر پہنچ گئے ۔ بھائی جان بس میں سو گئے تھے۔انھیں اُٹھا کر ہم بس سے نیچے اُتر آئے ۔یہاں سے آگے ہمیں رکشے پر جانا تھا۔ابھی ہم سڑک عبور کر ہی رہے تھے کہ بھائی جان کی نظر سڑک کے کنارے ایک شخص پر پڑی جو ایک چھوٹے سے بچے کو زبردستی اپنے ساتھ کھینچ کر لے جا رہا تھا، جب کہ بچہ رو رہا تھا۔ بچے کے کندھوں پر اسکول بیگ لٹکا ہوا تھا۔ہم بھی یہ صورتِ حال دیکھ چکے تھے۔ بھائی جان نے ہمارے طرف دیکھا، پھر ان پر جیسے جوش سا طاری

ہوگیا۔ بولے: ''ضرور یہ کوئی غنڈہ ہے جو بچے کو زبردستی اغوا کر کے لے جا رہا ہے، ہمیں اس بچے کی مدد کرنی چاہیے۔''

''لیکن یہ کوئی خطرہ بھی تو ہوسکتا ہے۔'' ہم نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا تو بھائی جان گرج کر بولے: ''نہیں، یہ وقت ڈرنے کا نہیں کچھ کر دکھانے کا ہے، آج اپنی بہادری دکھانے کا دن آ گیا ہے، آج نہیں تو پھر کبھی نہیں، ہمارے بازوؤں میں جان ہے تو صرف اسی لیے کہ ہم بہادر بنیں اور دوسروں کی مدد کریں۔''

بھائی جان کی ولولہ انگیز تقریر سن کر ہماری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور ہم پر بھی بہادری کا جنون چڑھ گیا، ورنہ تو ہم اتنے بہادر تھے کہ باتھ روم نہ جاتے جب تک دیوار پر چپکی ہوئی چھپکلی کسی سوراخ میں گھس نہ جائے۔ اسی وقت بھائی جان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آن کی آن میں اس شخص پر ٹوٹ پڑے۔ ہم بھی ان کے پیچھے لپکے اور بچے کو سنبھالا۔ بھائی جان اپنے مکوں کے تابڑ توڑ حملوں سے اس شخص پر وار کیے جا رہے تھے۔ بچہ اب رونا بند ہو چکا تھا اور پریشانی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

''ارے، یہ میرے ابو ہیں۔ یہ انکل انھیں کیوں مار رہے ہیں، مجھے اسکول نہیں جانا۔'' بچے نے یہ کہہ کر گویا ہمارے سر پر بم ہی پھوڑ دیا۔ ہماری جان ہی نکل گئی۔ ہم نے فوراً بھائی جان کی طرف دیکھا، جو اس شخص کو مار مار کر ادھ موا سا کر چکے تھے۔ پھر اچانک ایک طرف سے کچھ لوگ ہماری طرف بڑھتے چلے آئے۔

''انکل تنویر آ گئے، انکل تنویر آ گئے۔'' بچے نے ان لوگوں کی طرف دیکھ کر خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔ یہ سننا تھا کہ ہمارے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ یہ لوگ ضرور اس شخص کو جانتے تھے۔ وہ لوگ آتے ہی بھائی جان پر ٹوٹ پڑے۔ بھائی جان سنبھل نہ سکے۔ اتنے سارے لوگوں نے مل کر بھائی جان کا بھرکس نکال دیا۔ ہم نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تو ایک دو گھونسوں سے ہمارا چہرہ بھی ''سرخ رو'' ہوگیا۔ ان لوگوں نے اپنی طاقت کے بے شمار ثبوت بھائی جان کے چہرے پر چھوڑے تھے۔ آخر جب وہ

تھک کر چلے گئے تو ہم نے بھائی جان کی طرف نظریں دوڑائیں اور ان کی شکل دیکھ کر ہی ڈر گئے۔ بھائی جان بہت ہی بھیانک لگ رہے تھے۔ اس وقت ہم ان کے واحد سہارا تھے۔ آخر ایک کلینک سے بھائی جان کی پٹی کروانے کے بعد ہم خالہ نظیراں کے گھر پہنچ ہی گئے۔ بھائی جان کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئیں، لیکن ہم نے انھیں تسلی دی اور اندر آ گئے۔ خالہ نظیراں کو تھیلا تھمایا۔

''تم لوگ کھانا تو کھا کر آئے ہو گے؟'' انھوں نے پوچھا پھر خود ہی بولیں: ''ہاں، ہاں کھا پی کر ہی آئے ہو گے۔ اس وقت تک تو تم نے ضرور کھانا کھا لیا ہو گا۔''

اس وقت ہمارے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ صبح سے صرف مار ہی کھائی تھی۔ ہم نے فوراً اجازت طلب کی اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ خالہ نظیراں پیچھے سے: ''ارے بیٹھو، بیٹھو.....'' کہتی رہ گئیں، لیکن ہم نے وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

تقریباً شام کے وقت ہم گھر پہنچے تو ابا جان دروازے پر ہمارے استقبال کے لیے تیار تھے۔ بھائی جان کی حالت کا پوچھا تو ہم نے سب گول مول کر دیا۔

''اچھا برخوردار! اب مجھے ایک بات بتاؤ۔ ابا جان نے پوچھا: ''یہ بتاؤ تم دونوں میں سے تھیلا کون اُٹھا کر لے گیا تھا.....؟''

ابا جان نے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا تو ہم نے سینہ پھلا کر جواب دیا: ''ہم نے، سارے راستے تھیلا ہم نے اُٹھایا تھا، ہم ہیں وہ ہوشیار اور ہونہار، ہم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ بھائی جان تو کسی کام کے نہیں۔''

ابھی ہماری بات ختم نہ ہوئی تھی کہ ابا جان کا ایک زوردار تھپڑ ہمارے گال پر پڑا: ''ارے بد بخت! ستیاناس ہو تمھارا، جو تھیلا لے کر جانا تھا وہ تو تم یہیں بھول گئے اور میرے اوزاروں کا تھیلا اُدھر دے آئے ہو۔'' ابا جان کا غصہ آسمان پر پہنچ چکا تھا اور ہمیں اپنی عقل پر غصہ آ رہا تھا۔ آج کا دن واقعی غضب کا تھا۔

انعامی سلسلہ ۲۸۶

معلومات افزا

س۔ف

درجِ ذیل ۱۰ سوالات کے جوابات **۱۵ اکتوبر ۲۰۱۹ء** سے قبل بھجوادیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا ضروری ہے۔ تمام درست جواب دینے والے پندرہ نونہال انعام کے حق دار ٹھہریں گے۔ تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں انعام کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے گا۔

۱ حضرت نوحؑ کے بیٹوں میں سے ایک نافرمان بیٹا.....اپنی کافرماں کے ساتھ پانی میں ڈوب گیا تھا۔
(حام ۔ سام ۔ کعنان)

۲ غزوہ احد اور خندق میں کافروں کے سردار حضرت..... تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے۔
(ابوہریرہؓ ۔ ابوسفیانؓ ۔ ابوذر غفاریؓ)

۳ قدیم شہنشاہیت اب تک صرف.....میں قائم ہے۔ (جاپان ۔ چین ۔ ویت نام)

۴ انگلستان اور شمالی آئرلینڈ کے الحاق سے.....میں سلطنتِ برطانیہ قائم ہوئی۔(۱۵۵۸ء ۔ ۱۶۰۳ء ۔ ۱۶۲۵ء)

۵ ''لسان العصر''، مشہور شاعر.....کو کہا جاتا ہے۔(جوش ملیح آبادی ۔ جگر مرادآبادی ۔ اکبرالہٰ آبادی)

۶ مشہور کتاب ''کولتار'' کے مصنف..... ہیں۔(امتیاز علی تاج ۔ خواجہ حسن نظامی ۔ عظیم بیگ چغتائی)

۷ ''Porcupine''، انگریزی زبان میں.....کو کہتے ہیں۔ (جونک ۔ پسّو ۔ خارپشت)

۸ دنیا کی واحد رنگین گیس..... ہے جو سبز مائل زرد رنگ کی ہوتی ہے۔(آرگان ۔ کلورین ۔ نائٹروجن)

۹ اردو زبان کی ایک مثل ہے: ''وہم کی دوا حکیم..... کے پاس بھی نہیں تھی۔'' (لقمان۔ چوہان۔ جبران)

۱۰ حضرت ابراہیم ذوقؔ کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

اے ذوق کسی ہم دمِ دیرینہ کا ملنا ..... ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے (اچھا ۔ بہتر ۔ خوب)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۸۶ (اکتوبر ۲۰۱۹ء)

نام : _____

پتا : _____

عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (اکتوبر ۲۰۱۹ء)

عنوان : _____

نام : _____

پتا : _____

عمر : _____ تعلیم : _____

کوپن برائے نام بوجھیے (اکتوبر ۲۰۱۹ء)

نام شخصیت : _____

نام نونہال : _____ عمر : _____ تعلیم : _____

پتا : _____

ایک کوپن، ایک نونہال کے لیے ہے۔ ایک ہی عنوان لکھیے۔
اپنا پتا صاف اور خوش خط لکھیے۔ کوپن کو A4 سائز کے کاغذ پر چسپاں کیجیے اور
۱۵ اکتوبر ۲۰۱۹ تک بھجوا دیجیے۔

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری ہمدرد فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں کا ایک حصہ ہے۔ ہر مہینے پورے پاکستان میں ہزاروں مریضوں کا مفت طبی معائنہ کرنے کے بعد مفت ادویات بھی دی جاتی ہیں۔ یہ فری موبائل ڈسپنسریاں کراچی، لاہور، ملتان، بہاول پور، فیصل آباد، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، سکھر، حیدرآباد اور آزاد کشمیر میں مستحق مریضوں کے لیے مخصوص ہیں۔

کراچی کے لیے چھے گاڑیاں درجِ ذیل علاقوں میں خدمت پر مامور ہیں

غازی آباد، گلشن بہار، اورنگی نمبر 13، قائم خانی کالونی، بلدیہ ٹاؤن، نیو کراچی سیکٹر D-11، سیکٹر F-11، نئی آبادی، یوسف گوٹھ، لیاری ایکسپریس وے، خدا کی بستی، کورنگی نمبر 2، کورنگی سو کوارٹرز، کورنگی نمبر 4، ونگی گوٹھ، محمود آباد، عمر گوٹھ، ایوب گوٹھ، مدرسہ انوارالایمان، سلطان آباد، مدرسہ منبع العلوم، وھیل کالونی، اکبر گراؤنڈ، مہاجر کیمپ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 3، شفیع محلّہ (لال مسجد)، نور شاہ محلّہ، مواچھ گوٹھ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 7، مشرف کالونی بلاک سی، ایف، ای اور اے روڈ، لیاقت آباد پیلی کوٹھی، کوثر نیازی کالونی، مجید کالونی اور ملیر۔

جوابات معلومات افزا ۲۸۴-

اگست ۲۰۱۹ء میں شائع ہونے والے معلومات افزا-**۲۸۴** کے درست جوابات ذیل میں لکھے جارہے ہیں۔اس بار تمام درست جوابات دینے والے نونہالوں کی تعداد **۱۵** ہی تھی، ان **۱۵** نونہالوں کوایک ایک کتاب روانہ کی جائے گی۔ باقی نونہالوں کے نام شائع کیے جارہے ہیں۔

۱۔ کفار مکہ سے مسلمانوں کی پہلی جنگ غزوۂ بدر تھی۔
۲۔ اسلام سے پہلے جمعہ کے دن کو عُروبہ کہا جاتا تھا۔
۳۔ دنیا کے سب سے پہلے سرجن ابوالقاسم زہراوی کے ایجاد کردہ آلاتِ جراحی آج تک استعمال ہورہے ہیں۔
۴۔ پاکستان کا ایک تفریحی مقام سوات، مالاکنڈ ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔
۵۔ مصر کی کرنسی مصری پاؤنڈ کہلاتی ہے۔
۶۔ مشہور داستان ''باغ و بہار'' سنہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف کی گئی تھی۔
۷۔ سب سے پہلا مصنوعی سیارہ اسپوتنگ روس نے خلا میں بھیجا تھا۔
۸۔ ''نقشِ فریادی''، فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔
۹۔ اردو زبان کا ایک محاورہ یہ ہے: ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔''
۱۰۔ علامہ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم　　بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے پندرہ خوش قسمت نونہال

☆ کراچی: محمد سفیان فیصل، سید صارم علی، سیدہ ناہید نرگس، رباب فاطمہ، حسان خالد ☆ لاہور: رامین سجاد، حفصہ سجاد، اُسامہ ضیا ☆ مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ راولپنڈی: ہانیہ نور بٹ
☆ حیدرآباد: مریم بنتِ کاشف، سیدہ محمد حسین شاہ، محمد یوسف قریشی، عائشہ ایمن عبداللہ۔

۹ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ کراچی: ماریہ مقیم، عبدالباسط وسیم، زبیر سلطان محمود، سیف اللہ پشاوری ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعدیہ کوثر مغل ☆ ڈیرہ غازی خان: رفیق احمد ناز ☆ لاہور: ولید اشرف۔

۸ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ کراچی: سیدہ فاطمہ شعیب، محمد حذیفہ آفتاب ☆ حیدرآباد: طلحہٰ صادق۔

بلاعنوان انعامی کہانی

ظل حنا

اگر مجھے اس ملک کا نام یاد ہوتا تو میں تم کو ضرور بتا دیتا، لیکن واقعہ جو میں بتاؤں گا بالکل سچا ہے۔ خیر آؤ، فرض کریں کہ اس ملک کا نام تھا انڈھارت۔

ہاں تو بھئی واقعہ یوں ہے کہ وہاں ایک انگریز افسر نیا نیا تعینات ہوا۔ افسر سیدھا لندن سے آیا تھا اور وہاں سے اتنی جلدی میں روانہ ہوا تھا کہ نہ تو اپنے ساتھ ضروری سامان لا سکا تھا اور نہ ہی اس کے بیوی بچے اس کے ساتھ آ سکے تھے۔ اب اس حالت میں بھلا وہ اپنا ذاتی نوکر کس طرح اپنے ساتھ لاتا۔ سچ پوچھو تو وہ بے چارہ اس ملک میں اس طرح پہنچا جیسے جلا وطن ہو کر آیا ہو۔ نیا

ملک اور نئے ملک کے نئے لوگ۔ پھر سب سے بڑھ کر نئی زبان وہ ہر وقت جھنجلاہٹ میں مبتلا رہنے لگا۔ اس ملک کی زبان اس کے لیے قطعی اجنبی تھی، کیوں کہ وہ تھا خالص انگریز اور یہاں خالص اردو بولی جاتی تھی۔ پھر بھلا اس کی سمجھ میں کیا خاک آتا.....!

اور ہاں یہ بتا دینا بہت ضروری ہے کہ اس کا نام جانسن تھا، کیوں کہ اگر اس کا نام کچھ اور ہوتا تو شاید یہ واقعہ ہی پیش نہ آیا ہوتا۔

انڈھارت کے لوگ انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ملک نیا نیا انگریزی عمل داری میں داخل ہوا تھا۔ اب کوئی زبان اتنی جلدی تو اپنائی نہیں جاسکتی۔

جانسن صاحب کو چارج لیے ہوئے چار دن ہو چکے تھے اور اس طرح اس کی اُلجھن روز دوگنی ہوتے ہوتے پوری سولہ گنی ہوگئی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد پاگل ہو جائیں گے۔ شام کا وقت تھا اور وہ آفس سے لوٹنے کے بعد اپنے پائین باغ میں آرام کرسی پر آدھے لیٹے اور آدھے بیٹھے اپنے نوکر کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ رات کے کھانے پر مٹن چانپ اور کٹلٹ کھانا چاہتے ہیں۔ نوکر کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ مالک آخر کیا کہہ رہا ہے۔ آخر تنگ آکر جانسن صاحب نے ہاتھ کے پُرزور اشارے کے ساتھ نوکر سے انگریزی میں فرمایا: ''چل بھاگ.....ایڈیٹ۔''

ایڈیٹ بات تو خیر کیا سمجھتا ہاں غصہ دیکھ کر بنگلہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ صاحب کو شبہ ہوا کہ کسی نے انگریزی میں کچھ کہا ہے۔ کوے کے گھونسلے میں بلبل کی آواز سن کر صاحب چونکے اور دیکھا کہ دبلا پتلا سا ایک لڑکا سامنے کھڑا تھا۔ جس کا لباس تو صاف نہیں، مگر پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت ضرور جھلک رہی تھی۔

سخت گرمی کی گھٹن میں گویا ٹھنڈی خوش گوار پھوار پڑ گئی۔ لڑکے نے صاحب کے سر اُٹھاتے ہی پھر

انگریزی میں نوکری کی درخواست کی۔

صاحب اور وہ لڑکا دونوں ہی محاورے کے مطابق اندھے تھے اور دونوں ہی دو آنکھیں چاہتے تھے۔ وہ انھیں مل گئیں۔ صاحب کو خاطر خواہ نوکر اور نوکر کو خاطر خواہ صاحب!

لڑکے نے بتایا کہ اس کا نام عاقل ہے۔ پہلے وہ کسی اور انگریز کا ملازم تھا اور وہیں اس نے تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی تھی۔ اب اس کی خواہش تھی کہ باقاعدہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرے۔ جانسن صاحب نے سب سے پہلے اس سے یہ کام لیا کہ اپنے سابق نوکر کو تنخواہ سے چار گنا روپیہ دے کر فوراً بھگایا اور وہ نوکر خود بھی بہت تیزی سے بھاگا۔

عاقل نے چند روز میں ہی ثابت کر دیا کہ وہ واقعی بہت عقل مند ہے۔ صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ اس میں چوری کی بُری عادت نہیں تھی۔ بہت ایمان دار تھا۔ ادب کرتا تھا اور اپنا فرض بڑی تندہی سے انجام دیتا تھا۔

وہ نہایت سمجھ دار تھا اور بہت ہوش مندی سے روپیہ خرچ کرتا تھا، کیوں کہ وہ کسی ایسے اسکول میں داخلہ لینا چاہتا تھا، جہاں انگریزی پڑھ سکے۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے بہت تھوڑا سا روپیہ خرچ کیا کرتا اور باقی جانسن صاحب کے پاس جمع کرا دیا کرتا۔ جانسن صاحب اس کے اس اصول کو بہت پسند کرتے تھے کہ وہ اپنی آمدنی بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتا ہے، مگر ایمان داری کے ساتھ اور واقعی حقیقت بھی یہی تھی۔

اگر عاقل اپنے آقا کے منگائے ہوئے کسی سودے میں سے کچھ رقم اپنے واسطے بچا لیتا تو اس طرح کہ نہ اس کے آقا کو نقصان ہو اور نہ سودا بیچنے والے کو خسارہ ہوتا۔ یہ بات ذرا عجیب اور ناممکن تو معلوم ہوتی ہے، مگر ہے حقیقت۔

ایک دن جانسن صاحب نے عاقل سے کہا کہ انڈھارت والے انگریزی سے قطعی نہ واقف ہیں۔

اس لیے ان کا انگریزی کی مہر سے کام چلنا مشکل ہے۔ بہتر ہو کہ ایک اردو کی مہر بنوائی جائے۔
یہ سن کر عاقل مہر سازوں سے ملنے گیا اور مہر بنوانے کا نرخ معلوم کیا۔ اس کو زیادہ تر دکان داروں نے بتایا کہ مہر سازی کا نرخ دو روپے فی حروف ہے۔ کہیں کہیں اس سے زیادہ بھی تھا، مگر کم کہیں نہیں۔ عاقل نے واپس آ کر تمام تفصیل صاحب کو بتائی تو صاحب نے اس سے پوچھا: ''میرے نام میں کتنے حروف ہیں؟''
''پانچ جناب۔'' عاقل نے حروف گن کر بتائے۔ صاحب نے دس روپے اس کے حوالے کیے اور کہا: ''لو ذرا جلدی سے بنوا لانا۔'' پھر صاحب نے عاقل کو جاتے دیکھ کر مذاق کیا: ''ہم تو جب جانیں جب تم اپنے لیے بھی کچھ بچا لو۔'' عاقل نے یہ بات سن تو لی، مگر جواب کچھ نہ دیا، کیوں کہ وہ خود بھی تو یہی سوچ رہا تھا۔
بازار پہنچ کر اس نے قریب قریب ہر مہر ساز سے بات کی، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ کوئی بھی دو روپے فی حروف سے کم لینے پر راضی نہ ہوا۔ عاقل نے سوچا کیا میں مایوس ہو جاؤں۔ اب اور چارہ بھی کیا ہے، مگر اسی وقت اس کے دماغ میں ایک ترکیب آ گئی۔
پھر کیا تھا۔ اس نے صرف چند منٹ اپنی تجویز پر غور کیا اور سب سے نزدیک والے اور سیدھے سادے مہر ساز کی دکان پر پہنچ گیا۔
''مہر بنوانے میں فی حروف کتنا خرچ ہوتا ہے؟'' اس نے پہنچتے ہی پوچھا۔
''تم پھر آ گئے؟'' دکان دار نے ٹھنڈی سانس بھری: ''کتنی بار نرخ پوچھو گے؟''
''معاف کرنا چچا! عاقل نے پھرتی سے خاکسار بنتے ہوئے کہا۔ تم یہ بتاؤ کہ مہر پر اگر لفظ ''چانس'' لکھو تو کیا لو گے۔ کچھ کم لے لینا۔''
''پھر وہی کم..... کم تو کچھ نہ ہوگا۔ یہ میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں، اور ہاں یہ چانس کیا ہوتا

ہے.....''

''مسٹر چانس میرے آقا کا نام ہے، انگریز ہے۔''

''یہ انگریزوں کے نام بھی، اونھ، مجھے کیا ہاں تو چانس لکھنے میں چ۔ا۔ن۔س۔ چار حروف یعنی چار دونی آٹھ روپے ہوئے۔ بولو؟''

''بولوں، کیا یہ لو آٹھ رپے اور شروع ہو جاؤ، مجھے ذرا جلدی ہے۔''

مہر ساز نے فوراً کام شروع کر دیا اور عاقل نے بھی جلدی کے تقاضے میں دیر نہیں کی۔ وہ بار بار کہنے لگا: ''چچا! جلدی، ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ۔''

آخر دکان دار جھنجلا گیا: ''جلدی کیسے کروں کوئی نقطہ وغیرہ چھوٹ گیا تو.....''

''اوہ.....تم نقطوں کی فکر نہ کرو، رہے چا ہے چھوٹے۔ مالک تو ہے انگریز، وہ اردو کیا جانے، بلکہ میں تو خود تم سے کہنے والا تھا کہ دو ایک نقطے گول کر جاؤ۔''

''یہ لڑکا ضرور پاگل ہے۔'' مہر ساز نے زیرِ لب کہا۔

''ہاں چچا! تم پہلے حروف ملا کر لکھ دو۔'' عاقل نے اپنی بات جاری رکھی: ''نقطے بعد میں، میں جہاں کہوں وہاں لگا دینا۔''

''پاگل ہے تو میرا کیا نقصان ہے۔'' مہر ساز نے سوچا۔ میری تو محنت بچے گی۔

''لو اب بتاؤ'' دکان دار نے اوزار سنبھالتے ہوئے کہا۔

''حروف ملا دیے ہیں۔ نقطے کہاں لگاؤں؟''

''چچا میں ذرا سوچ لوں۔ خیر تم چ کے نیچے تین کے بجائے ایک نقطہ تو لگاؤ مہر ساز نے ''چ'' کے نیچے ایک نقطہ لگا دیا۔

''لو دیکھو'' عاقل نے مہر لے کر دیکھی اور واپس کرتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے چچا! چانس میں سب

ملا کر چار نقطے ہوتے ہیں تم تین ہی لگا دینا ایک معاف سمجھو۔ تمھاری محنت بھی بچے گی ایک تو لگا ہی چکے ہو بس دو اور لگا دو۔''

''بے چارہ'' مہر ساے نے عاقل کی دماغی حالت پر دل ہی دل میں افسوس کیا اور پھر بولا:

''''کہاں لگاؤں؟ پہلے نقطے کے پاس یا ''ن'' پر؟''

''نہ یہاں نہ وہاں بلکہ ایسا کرو کہ ''س'' کے پیٹ میں لگا دو، اچھا لگے گا اور دوسرا 'ن' پر۔''

''الو کہیں کا'' دکان دار نے بڑی صفائی سے قہقہہ روکتے ہوئے سوچا اور پھر ایک نقطہ ''س'' کے دائرے میں لگا کر مہر عاقل کے حوالے کر دی ''ارے ذرا ٹھہرنا'' مہر ساز نے عاقل کو جاتے دیکھ کر پکارا۔ یہ تو جانسن ہو گیا۔''

''ہاں چچا! عاقل نے فاتحانہ تبسم سے جواب دیا۔ میرے دو رپے بچے اور تمھاری بہت سی محنت۔ ہاں تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے مالک کا نام 'چانس' نہیں 'مسٹر جانسن ہے' السلام علیکم۔''

اور دکان دار کا منھ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال اگست ۲۰۱۹ء میں جناب رحمت علی کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد تین اچھے عنوانات کا انتخاب کیا ہے، جو تین نونہالوں نے مختلف جگہوں سے بھیجا ہے۔

۱۔تین احسان شناس : وقاص رفیق، کراچی

۲۔ دھوپ چھاؤں : رامن سجاد، لاہور

۳۔ موتی کی تلاش : رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان

﴿ چند اور اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں ﴾

احسان کا بدلہ۔غریب ہی اچھا۔جادو کا پتھر۔

قناعت کی دولت۔رحم دلی کا صلہ۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں دل چسپ عنوانات بھیجے

☆ کراچی: ناعمہ تحریم، رباب فاطمہ، عبدالباسط وسیم، سیدہ ناہید نرگس، سیدہ زینب علی، ماریہ مقیم، زبیر سلطان محمود، سید محمد احمد ، سیف اللہ پشاوری ☆ لاہور: حفصہ سجاد ☆ حیدرآباد: مریم بنتِ کاشف، محمد یوسف قریشی، عائشہ ایمن عبداللہ ☆ راولپنڈی: زہرا نور بٹ ☆ ٹیاری: تیمور جان بھلم پٹھان، فاروق جان بھلم پٹھان ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ مظفر گڑھ: محمد یحییٰ خان لغاری ☆ ڈیرہ نواب شاہ: مصباح آصف۔

اردو اخبارات کی تاریخ

شکیل صدیقی

اردو اخبارات کی تاریخ کافی پرانی ہے اور ہندو پاک کی تقسیم سے پہلے وہاں سے شائع ہوتے تھے۔لفظ اردو ترکی زبان سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں لشکری۔ یہ مغل حکمراں شاہ جہاں کے زمانے میں پھلی پھولی۔ اردو میں فارسی، ہندی، ترکی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے۔اتر پردیش میں اردو زبان کو بہتر اور رواں بنایا گیا۔عربی اور فارسی کی طرح اسے دائیں سے بائیں ہاتھ کی طرف لکھا جاتا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر ۳۹ حروف ہیں اور ۱۳ اضافی۔ اس طرح کل ۵۲ حروف

ہوتے ہیں۔ پاکستان میں نصاب سے فارسی ختم ہونے کے بعد اردو کو بہت فروغ ملا۔

اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' تھا جو ہیرا ردتا نے ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے شائع کیا تھا۔

۱۴؍جنوری ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے ہفت روزہ ''کوہِ نور'' شائع کرنا شروع کیا جو ساڑھے تین سو کی تعداد میں فروخت ہوتا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں منیر خیر الدین نے اردو گائڈ کے نام سے کلکتہ سے پہلا روزنامہ شائع کیا۔ ایک اور اہم اخبار جو اس زمانے میں شائع ہوا، وہ لاہور سے شائع ہونے والا ''روزنامہ پنجاب'' تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ سے منشی نول کشور نے ۱۸۵۸ء میں اردو کا پہلا اخبار ''اودھ اخبار'' شائع کرنا شروع کیا۔

اخبار تو زیادہ فروخت نہیں ہوتے تھے، لیکن اردو کو فروغ دینے کے لیے پڑھے لکھے افراد نے کوششیں شروع کر دیں۔ مثلاً علی گڑھ سے ''تہذیب الاخلاق'' مدراس سے ''شمس الاخبار'' بمبئی سے ''کشف الاخبار'' شائع ہوئے۔ یہ سب ہفت روزہ تھے۔ البتہ ''اودھ اخبار'' روزنامے کی شکل میں شائع ہونے لگا اور منشی نول کشور کے بعد اس کے مدیر رتن ناتھ سرشار ہو گئے۔ یہ اخبار کافی عرصے تک شائع ہوتا رہا۔

دہلی سے شائع ہونے والا پہلا اخبار ''فوائد الناظرین'' تھا جو راما چندر نے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا۔ یہ اخبار لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہندو پاک پر انگریزوں کی حکومت تھی اور یہ اخبار حکومت پر تنقید کرتا تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سجاد حسین نے اردو کا پہلا مزاحیہ ماہنامہ ''اودھ پنچ'' شائع کرنا شروع کیا، جسے لوگوں نے پسند کیا۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں تین روزنامے شائع ہو رہے تھے۔ پیسہ اخبار، اودھ اخبار اور صلح کُل تینوں عوامی اخبارات تھے اور میانہ روی سے شائع ہوتے تھے، لیکن ان کے بعد شائع ہونے والے اخبارات انگریزوں کے بہت خلاف تھے، جن میں زمیندار تھا جو لاہور سے ۱۹۰۳ء میں شائع ہونا

شروع ہوا۔اس کی اشاعت تیس ہزار تھی ۔ پھر۱۹۰۴ء میں مولوی ثنا اللہ خان نے ہفت روزہ ''وطن'' شائع کرنا شروع کیا، جو۳۳ برس تک شائع ہوتا رہا۔۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ''نقیب ہمدرد'' شائع کرنا شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' شائع کرنا شروع کیا۔اس اخبار میں سیاست کے علاوہ مذہبی مضامین ہوتے تھے۔اس کے مضامین اور ان کے پیش کرنے کا انداز سب سے جدا تھا۔ چناں چہ اسے خوب شہرت حاصل ہوئی۔۱۹۱۹ء میں مہشی کرشنن نے لاہور سے ''پرتاب'' شائع کرنا شروع کر دیا۔ یہ گاندھی جی کے خیالات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔اس میں زیادہ تر کانگریس کی خبریں ہوتی تھیں۔ چوں کہ انگریزوں کے خلاف تھا،اس لیے کئی بار بند ہوا۔اس اخبار کا پنجاب کے اردو پڑھنے والوں اور دہلی میں رہنے والوں پر گہرا اثر تھا۔۱۹۴۵ء میں جواہر لال نہرو نے ''قومی آواز'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔

ان اخبارات نے لوگوں میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔ ان اخبارات میں سیاست کے علاوہ سماجیات اور ادب بھی ہوتا تھا۔ غزل،نظم، کہانیاں، ڈرامے اور افسانے وغیرہ۔ اس کے علاوہ خواتین کی دل چسپی کے لیے ادبی مضامین،کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبیں بھی ہوتی تھیں۔

انگریزوں کے خلاف اردو اخبارات نے جو تحریک چلائی ان میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں کی سیاسی جماعت کانگریس اور مسلمانوں کی مسلم لیگ تھی۔

ہندو پاک کی تقسیم کے موقع پر اردو صحافت کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔لاہور میں فسادات کے دوران ''ملاپ'' کی مشینیں اور کاغذ جلا دیا گیا۔ساتھ ہی اس کے مدیر کو بھی قتل کر دیا گیا۔جس کے نتیجے میں چھے ہفتوں تک اخبار شائع نہیں ہوسکا۔اس کے بعد یہ اخبار دہلی سے شائع ہونے لگا۔ لاہور میں حالات اچھے نہیں تھے۔اس لیے ''پرتاب'' بھی دہلی سے شائع ہونے لگا۔

ہندو پاک کی تقسیم کے وقت کُل ۴۱۵ روزنامے ہفت روزے اور ماہنامے شائع ہوتے تھے۔جس

میں سے ۳۴۵ کا تعلق بھارت سے تھا، جب کہ ۷۰ پاکستان سے شائع ہونے لگے۔ بعد میں ان کی تعداد بڑھ کر ۵۱۳ ہوگئی۔

روزنامہ ''جنگ'' ۱۹۳۹ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ میر خلیل الرحمٰن اس کے مالک اور مدیر تھے۔ اس میں ملک کے اچھے لکھنے والوں کی تحریریں شائع ہوتی تھی۔ مثلاً مجید لاہوری، شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، ابنِ انشا اور پیر علی محمد راشدی۔

ادارہ جنگ، عوام ہفت روزہ میگ، دی نیوز، ہفت روزہ اخبار جہاں اور ڈیلی نیوز بھی شائع کرتا ہے۔

کراچی سے شائع ہونے والے اخباروں میں ''حریت'' کافی مقبول ہوا۔ اس کے مدیر فخر ماتری تھے۔ یہ چھوٹے سائز کا اخبار تھا جس کی خبریں اور کالم دوسرے اخبار سے قطعی مختلف تھے۔ یہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ مشہور ناول نگار ابنِ صفی نے صحت یاب ہونے کے بعد ایک ناول ''ڈاکٹر دعا گو'' اس میں قسط وار لکھنا شروع کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد یہ اخبار نامعلوم وجوہ کی بنا پر بند ہوگیا۔

اردو اخبارات میں روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور اور روزنامہ ''انجام'' کراچی بھی کافی مقبول ہوئے۔ انجام کچھ عرصے تک شائع ہوتا رہا اس کے بعد بند ہوگیا۔ البتہ نوائے قت اب بھی شائع ہو رہا ہے۔

تقریباً اٹھارہ برس پہلے شائع ہونے والے اخبار ''ایکسپریس'' کو اس کی خبروں اور کالموں کی وجہ سے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ چناں چہ پاکستان کے دوسرے بہت سے شہروں سے شائع ہونے لگا اور اب بھی شائع ہو رہا ہے۔

انگریزی اخبارات میں ''ڈان'' سب سے بڑا اخبار ہے۔ یہ تقسیم ہند و پاک سے پہلے ۱۹۴۱ء میں ہفت روزہ کی حیثیت سے شائع ہوا تھا، اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں روزنامہ ہوگیا۔ اس کی بنیاد قائداعظم محمد علی جناح نے دہلی میں رکھی تھی۔ اسے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی آواز کہا جاتا تھا۔ روزنامہ ڈان اب بھی پاکستان کے کئی شہروں سے شائع ہوتا ہے۔

نونہال ادیب

نونہال قلم کاروں کی تحریریں جو اُنہیں آگے چل کر یاد دلائیں گی کہ اُنھوں نے لکھنے کا آغاز کیسے کیا تھا

- محمد اسحاق کچھی، کراچی
- تبسم حسنی، کراچی
- محمد عبدالحماض الریان، کراچی
- محمد سعد اسد، تونسہ شریف
- اُسید الرحمٰن، کراچی
- رشنا جمال الدین، کراچی
- محمد شایان ندیم قائم خانی، سانگھڑ
- محمد احمد صدیقی، کراچی
- حافظہ عائشہ، کراچی
- محمد شایان زاہد، کراچی

حقوقِ والدین

محمد اسحاق کچھی، کراچی

تمام مسلمانوں پر دو قسم کے حقوق فرض ہیں:

۱۔حقوق اللہ ۲۔حقوق العباد۔

حقوق اللہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق کو کہتے ہیں، جب کہ حقوق العباد کسی بندے پر دوسرے بندے کے حق کو کہتے ہیں۔حقوق العباد میں سب سے پہلے والدین کے حق کا ذکر ہے۔

فرمانِ مصطفیٰ ؐ ہے کہ مجھے افسوس ہے اس شخص پر جس نے اپنی زندگی میں اپنے والدین میں سے ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان کی خدمت نہ کر کے داخلِ جنت نہ ہوا۔ والدین کا ادب واحترام اور اطاعت ہم پر ہر حال میں فرض ہے چاہے وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں، مگر جب وہ شریعت کے خلاف کوئی بات کہیں تو ہمیں دین اسلام پر قائم رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے والدین کی خوب سے خوب خدمت کرنے کی توفیق عطا کرے تاکہ ہم اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکیں۔

مجھے کاٹنا مت

تبسم حسنی، کراچی

ایک ننھا پودا ہوں میں
بڑا ہو کر سایہ دار بنوں گا
رسیلے اور میٹھے پھل دوں گا
مگر ہاں مجھے کاٹنا مت
میں دنیا کی خوب صورتی کا حصہ
دنیا کو بدصورتی میں بدلنا مت
مگر ہاں مجھے کاٹنا مت
بوقت ضرورت مجھے کاٹ لینا
مگر ہاں پھر نیا درخت لگانا ضرور
بنانا مت مجھے بے ثمر و بے سایہ

میرا خیال رکھنا ضرور
مگر مجھے کاٹنا مت
تھکے مسافر کو چھاؤں دیتا ہوں
سڑک کنارے.....
تنہا شجر کو کاٹنا مت

شہیدِ پاکستان

محمد عبدالحماض الریان، کراچی

شہید حکیم محمد سعید جن کا نام آج بھی پورے پاکستان میں احترام سے لیا جاتا ہے، کیوں کہ ان جیسی قد آور اور ہمدرد شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔

ان کی پیدائش ۹ر جنوری ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ جب وہ صرف دو سال کے تھے تو اپنے والد حکیم عبدالحمید کے سائے سے محروم ہو گئے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی والدہ محترمہ اور بڑے بھائی نے ان کی پرورش کی۔ انھوں نے صرف سات سال کی عمر میں حج کی سعادت حاصل کی۔ کم سنی ہی میں قرآن پاک بھی حفظ کرلیا۔ ۱۹ سال کی عمر میں دہلی کے ایک طبی کالج سے حکمت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے قائم کردہ دواخانہ ہمدرد میں اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کے ساتھ کام کرنے لگے۔

۱۹۴۰ء میں انھوں نے ہمدرد صحت کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۸ء میں دہلی چھوڑ کر پاکستان آئے اور کراچی میں آرام باغ کے آس پاس ایک چھوٹی سی جگہ خرید کر ہمدرد مطب کا آغاز کیا۔

۱۹۵۳ء میں بچوں کے مشہور رسالے ہمدرد نونہال کا پہلا شمارہ نکالا، جو کہ آج ۶۷ سال بعد بھی بلاناغہ شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں حکیم صاحب نے ہمدرد فاؤنڈیشن قائم کیا۔ جس کو بعد میں پاکستان کے لیے وقف کر دیا گیا۔

حکیم صاحب وقت کی بہت قدر کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ وقت کی قدر کرو، ورنہ یہ ریت کی طرح ہاتھ سے پھسل جائے گا اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔

انھوں نے پاکستان کے لیے بے شمار کارنامے انجام دیے۔ نونہالوں کے مستقبل کو تابناک بنانے اور ان کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی دینے کے لیے نونہال ادب کا شعبہ قائم کیا۔ جس کے تحت کہانیوں، معلوماتی کتب اور سفر نامہ کی صورت میں بچوں کے

بہترین ادب کا ذخیرہ سامنے آیا۔ وہ صوبہ سندھ کے گورنر رہے ان کا ایک ہی نعرہ تھا:

''پاکستان سے محبت کرو، پاکستان کی تعمیر کرو''

ان کی یہ حب الوطنی بعض ملک دشمن عناصر کو ایک آنکھ نہیں بھائی۔ جس کے نتیجے میں ۱۷/ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو انھیں روزے کی حالت میں شہید کر دیا گیا۔ وطن کے لیے کی گئیں بے لوث خدمات کے باعث آج بھی ان کو خدمتِ خلق اور تعلیم کے شعبوں میں رہنمائی کرنے والے ایک روشن مینار کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شہادت کے بعد ۱۶/ اگست ۲۰۰۰ء میں پاکستان کا اعلا سول اعزاز نشانِ امتیاز دیا گیا اور ان کی تاریخ پیدائش کو پاکستانی نونہالوں کا قومی دن قرار دیا گیا، جو حکیم صاحب کی بچوں سے محبت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

ہمت والا

محمد سعد اسد، تونسہ شریف

بہت عرصہ ہوا، کسی شہر میں ''ٹومبو'' نام کا لکڑہارا رہتا تھا۔ ایک دن ٹومبو جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا تو ایک زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا۔ اس کا ہاتھ خوف ناک حد تک سوج گیا۔ کسی رحم دل امیر شخص نے اس کا علاج کروایا، مگر زہر پھیلتا رہا۔ آخر اس کا بایاں بازو کاٹنا پڑا۔ اب وہ لکڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ اس نے سوچا، کہیں ملازمت کرلوں، مگر پھر سوچا کہ ایک ہاتھ کٹے شخص کو کون ملازم رکھے گا۔ آخر اس نے کوئی ہنر سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

وہ 'کومفو کراٹے'' سیکھنے کے ادارے میں داخل ہوا تو وہاں موجود تمام لوگ اس پر ہنس پڑے کہ دیکھو یہ ایک ہاتھ کٹا شخص بھی ''کومفو کراٹے'' سیکھے گا۔ کیا کومفو کراٹے سیکھنا اتنا آسان کام ہے۔ ٹومبو نے سوچا کہ پلٹ جاؤں، مگر پھر ہمت کر کے کومفو کراٹے سیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

''کومفو کراٹے'' کے استاد نے اسے ہر روز صرف ایک داؤ سیکھنے کی نصیحت کی۔ استاد نے اسے محض دس، بارہ داؤ سیکھائے کہ اسی طرح مخالف کو پچھاڑا جائے۔ دس بارہ دنوں کے بعد استاد نے اپنے ایک شاگرد کے ساتھ اس کا مقابلہ

کروایا۔ ٹومبو نے چند ہی سیکنڈوں میں اسے گرا دیا۔ استاد کے شاگردوں کو شکست دینا ٹومبو کا معمول بن گیا، کیوں کہ استاد ہر روز کسی شاگرد اور ٹومبو کا مقابلہ کرواتا، مگر ٹومبو جیت جاتا۔

اسی دوران ''کومفو'' کے عالمی مقابلے کا اعلان ہوا۔ ٹومبو نے اس میں بھی حصہ لیا۔ فائنل تک ٹومبو مسلسل جیتتا رہا۔ ٹومبو کے مدمقابل کے دونوں ہاتھ سلامت تھے۔ سب کا خیال تھا کہ ٹومبو ہار جائے گا۔ پہلے راؤنڈ میں ٹومبو کو اگرچہ چوٹیں لگیں، مگر اس نے ہار نہیں مانی اور پہلے راؤنڈ کی طرح دوسرے راؤنڈ میں مقابلہ برابر کا رہا۔ اگرچہ ٹومبو زخمی ہوا۔ تیسرا راؤنڈ شروع ہوئے ابھی محض بیس سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ ٹومبو نے مدِ مقابل کو پچھاڑ دیا۔ دور دور سے آئے ہوئے لوگ حیرت میں مبتلا تھے کہ کسی طرح اس ایک بازو والے نے مسلسل پانچ سال تک فاتح رہنے والے کو ہرا دیا۔ ٹومبو کو خود بھی یقین نہیں تھا، مگر جب ریفری نے اس کی فتح کا اعلان کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔

مقابلے کے بعد وہ اپنے استاد کے پاس گیا۔ اس نے عقیدت سے استاد کو سلام کیا۔ استاد نے اسے بتایا کہ ٹومبو میں نے تمھیں وہ داؤ سکھائے تھے کہ جن کا توڑ صرف اس وقت ہوسکتا ہے، جب کہ بایاں بازوں پکڑ لیا جائے۔'' ٹومبو حیرت زدہ رہ گیا اور اپنے استاد کا شکریہ ادا کیا۔

آپ بھی سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ خدانخواستہ کوئی معذوری ہو صرف ہمت اور لگن کی ضرورت ہے تو کیا خیال ہے؟

کھانا اور ڈنڈا

اُسید الرحمٰن، کراچی

کسی گاؤں کے لوگ بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ ان کے گاؤں میں کوئی مہمان آ جائے تو بہت آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے گاؤں میں ایک مہمان آیا۔ گاؤں والوں نے اس کے آگے طرح طرح کے کھانے دسترخوان پر چُن دیے۔ ساتھ ہی ایک بڑا سا ڈنڈا رکھ دیا۔ مہمان کھانے دیکھ کر بہت خوش ہوا،

لیکن ڈنڈا دیکھ کر ڈر گیا۔ میزبانوں سے پوچھا: یہ ڈنڈا کیوں رکھا ہے؟''

انھوں نے کہا: ''یہ ہماری روایت ہے۔ آپ ڈریں نہیں اور کھانا شروع کریں۔''

مہمان اڑ گیا کہ پہلے مجھے ڈنڈے کی حقیقت سے آگاہ کریں۔ میزبان لاکھ قسمیں کھائیں کہ اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، لیکن مہمان نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ دل ہی دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ کھانا کھلانے کے بعد یہ لوگ میری درگت بنائیں گے۔ مہمان کا کھانا کھانے سے انکار سن کر پورے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔

ایک بزرگ کو مہمان کے پاس لایا گیا کہ وہ ڈنڈے کی حقیقت بیان کریں۔ بزرگ ڈنڈا دیکھ کر غصے ہوئے اور کہا اتنا لمبا ڈنڈا نہیں رکھتے۔ اسے تین فیٹ کم کرو۔ ڈنڈے کو فوراً تین فیٹ کم کیا گیا، لیکن مہمان اب بھی کھانے سے انکاری تھا۔ وجہ ڈنڈے کی اب بھی لمبائی پانچ فیٹ تھی۔ گاؤں والے بہت پریشان ہوئے ایک اور بزرگ جن کی عمر نوے برس ہوگی ان کو لایا گیا۔ وہ بھی ڈنڈے کی لمبائی دیکھ کر آگ بگولا ہوگئے۔ کہنے لگے کہ ہاتھ کی لمبائی کے مطابق چھڑی رکھتے ہیں۔ اس کو کم کرو۔ ڈنڈے کٹ کر چھڑی کے برابر ہوگیا۔ اب چھڑی سے تو مہمان کو کوئی ڈر نہ تھا، لیکن اس کا تجسس برقرار تھا کہ اس ڈنڈے کی اصل حقیقت ہے کیا؟

آخر ایک بزرگ کو جن کی بھنوؤں اور پلکوں کے بال تک سفید تھے ڈنڈا ڈولی کر کے لایا گیا۔ انھوں نے چھڑی دیکھی تو برس پڑے اور کہنے لگے، پیالی میں ایک تنکا رکھا جاتا ہے تاکہ اگر مہمان کے دانتوں میں گوشت کا کوئی ریشہ رہ جائے تو وہ اسے نکال سکے۔ ڈنڈے کی حقیقت جان کر مہمان نے سکون کا سانس لیا، پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور گاؤں والوں کا شکریہ ادا کر کے اپنی راہ ہولیا۔

امداد باہمی

رشنا جمال الدین، کراچی

بھالو کو بہت بھوک لگی تھی۔ لمبے درختوں کے پاس

سے گزرتے ہوئے اس نے سر اوپر اُٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہاں شہد کا بڑا سا چھتا موجود تھا۔ بھالو درخت کے گرد گھومنے لگا کہ کس طرح اوپر چڑھے درخت بہت لمبا تھا۔ ہمت کر کے اس نے درخت پر چڑھنا شروع کیا، لیکن دھڑام سے نیچے گرا۔ دوبارہ اُٹھا پھر کوشش کی پر ناکام رہا اور حسرت سے شہد کو دیکھنے لگا۔

اچانک اس کے سر پر ایک اخروٹ گرا اس نے اخروٹ دیکھا پھر اوپر نظر اُٹھائی تو ایک گلہری درخت سے نیچے آ رہی تھی بھالو کو دیکھ کر رک گئی اور بولی: ''بھالو بھائی! مجھے بہت بھول لگی ہے۔ بہت دیر سے کوشش کر رہی ہوں اخروٹ نہیں ٹوٹ رہا۔ آپ مجھے اخروٹ توڑ کر دے دیں۔''

بھالو چڑ کر بولا: ''مجھے بھی تو بھوک لگی ہے اتنی دیر سے کوشش کر رہا ہوں، شہد تک نہیں پہنچ پا رہا ہوں۔ تم مجھے شہد لا دو، میں تمھیں اخروٹ توڑ کے دے دوں گا۔''

گلہری بولی: ''بھالو بھائی! میں آپ کو کیسے شہد لا کر دوں میرے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں درخت سے نیچے لانے تک بہ جائے گا۔''

بھالوں نے کہا: ''ہاں تم ٹھیک کہتی ہوں میری نہ سہی تمھارے بھوک مٹ جائے۔'' پھر اس نے اخروٹ توڑ کر دیا۔

گلہری جلدی جلدی اخروٹ کھانے لگی۔ جیسے ہی اخروٹ ختم ہوا اس نے بھالو سے کہا: ''ایک منٹ آپ یہاں رکیے۔ وہ تیزی سے اوپر گئی اور اخروٹ کے خالی خول میں شہد بھر بھر کے لانے لگی۔ بھالو مزے سے شہد کھاتا رہا۔ جب خوب سیر ہو گیا تو اس نے گلہری کا شکریہ ادا کیا۔

گلہری نے کہا: ''اگر آپ میری مدد کرنے میں پہل نہ کرتے تو مجھے بھی آپ کی مدد کرنے کا خیال نہ آتا۔''

پانی کی قدر

محمد شایان ندیم قائم خانی، سانگھڑ

تھر کا ایک چھوٹا قصبہ تھا۔ اس میں ایک محنتی کسان رہتا تھا۔ جس کا نام بادل تھا۔ نام تو اس کا بادل تھا، مگر اس

کا کھیت پانی سے محروم تھا۔ تھر کے لوگ پانی کی بوند بوند کو ترس رہے تھے۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کھیتی باڑی بہت کم تھی۔ جس کی وجہ سے یہاں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ بادل کا گزر بسر بھی کھیتی باڑی کر کے ہوتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا۔ جس کے لیے وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کا بیٹا غذا کی کمی کی وجہ سے ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا، جس کا علاج صرف شہر میں ہی ممکن تھا۔ رقم نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنا گھر بیچ دیا اور جب وہ شہر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لوگ بلاوجہ پانی کو ضائع کر رہے ہیں۔ اس کو بہت افسوس ہوا۔ تھر کے لوگ تو بوند بوند کو ترس رہے ہیں اور لوگ یہاں بلاوجہ پانی ضائع کر رہے ہیں۔ وہ یہ سوچتا کہ تھر کی زمینیں پانی نہ ہونے کی وجہ سے بنجر ہو چکی ہیں۔ انسانوں کی صحت خراب ہو رہی ہے اور جانور پیاس کی وجہ سے مر رہے ہیں اور شہر کے لوگ پانی کو ایک فاضل چیز سمجھ کر برباد کر رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے اللہ سے دعا کی کہ ان لوگوں کو ہدایت دے۔ بیٹے کا علاج مکمل ہونے کے بعد وہ واپس اپنے گاؤں چلا گیا۔ ہمیں اللہ کا ہر وقت شکر ادا کرنا چاہیے، کیوں کہ جو نعمت ہمارے پاس ہے، بہت سے لوگ اس نعمت کے لیے ترس رہے ہیں۔ پانی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔

واردات

محمد احمد صدیقی، کراچی

سیٹھ عرفان جلالی کپڑوں کے ایک بڑے تاجر تھے ان کے دو بیٹے تھے۔ بلال اور عمار۔ ان کی بیوی بہت پہلے انتقال کر چکی تھی۔

ایک دن تین نقاب پوش عمار کو اغوا کر کے گاڑی میں ڈال کر ویران کوٹھی کی طرف لے گئے۔ چند منٹ بعد ہی عمار کو ایک بڑے کمرے میں بند کر دیا گیا۔

سیٹھ عرفان جلالی کو اپنے بیٹے کی گم شدگی کی خبر ملی تو

ان کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ آخر ان کے دو ہی تو بیٹے تھے۔ صبح ہی اغوا کاروں نے فون کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ۳۰ لاکھ روپے کالی پہاڑی پر پہنچا دیے جائیں تو ان کو بیٹا واپس مل سکتا ہے، ورنہ اس کی لاش ہی ملے گی۔

سیٹھ عرفان نے کچھ سوچ کر انسپکٹر فرقان مرزا سے رابطہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد فرقان مرزا پہنچ گئے۔ سیٹھ عرفان نے تمام حالات شروع سے لے کر آخر تک سنا دیے اور بتایا کہ وہ اپنے دوست اطہر سے ملنے گیا تھا۔ اطہر کا پتا معلوم کر کے انسپکٹر فرقان ٹیم ساتھ لے کر اطہر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اُدھر اغوا کار اپنے باس کو رپورٹ دے رہے تھے کہ جب وہ اپنے دوست کے گھر سے باہر نکل کر جیسے ہی وہ ٹیکسی کی طرف بڑھا، ہم نے اس پر قابو پا لیا۔ ٹیکسی والے کو بھی بے ہوش کر دیا۔

''ارے یہ کیا غضب کر دیا؟'' باس چلّایا۔

ٹیکسی والا ہوش میں آ کر تمھارا حلیہ پولیس کو بتا دے گا۔ اب دوڑو اور ٹیکسی والے کو ختم کر دو۔ وہ تینوں فوراً ہی باہر نکل گئے۔

انسپکٹر کو اطہر کا گھر تلاش کرنے میں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اسے دوست کے اغوا کے بارے میں بتایا گیا تو اطہر نے کہا کہ عمار اس کے پاس آیا تھا۔ اطہر کے گھر سے وہ باہر نکلتے تو دو سپاہی دوڑتے ہوئے آئے: ''سر! یہاں قریب ہی ایک ٹیکسی میں کوئی آدمی بے ہوش پڑا ہوا ہے، آپ چل کر دیکھ لیں۔

وہ ٹیکسی تک آئے تو دیکھا کہ وہاں ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ انسپکٹر نے اسے ہوش میں لانے کی تدابیر شروع کر دی چند منٹ بعد ہی وہ ہوش میں آ گیا۔ معلومات حاصل کرنے پر نقاب پوشوں کا حلیہ پتا چل گیا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی حفاظت میں لے کر تھانے آ گئے۔ تھانے میں سب مجرموں کی تصویریں اسے دکھائیں تو اس میں سے ایک کو اس نے پہچان لیا اس طرح مجرموں کے نام بھی پتا چل گئے۔

تمام کے تمام سزا یافتہ تھے۔ سب انسپکٹر نے کہا آج کل ان کا ٹھکانا شہر کے جنوب کی طرف ہے۔ ادھر ایک پتلی سی سڑک ہے آگے کالی پہاڑی ہے، جس کے قریب ایک کھنڈر نما مکان ہے۔

انسپکٹر فرقان اپنی ٹیم کے ساتھ اس پرانی کوٹھی تک پہنچ گئے اور مجرموں کو گرفتار کر کے تہ خانے سے عمار کو بھی برآمد کر لیا۔

صاف دل

حافظہ عائشہ، کراچی

''آٹھویں جماعت میں اول آنے والی طالبہ ہیں ماہین علی۔'' سر ارشد نے ڈائس پر کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ آج اسکول میں سالانہ امتحان کے نتیجے کا اعلان کیا جا رہا تھا تو ہر سال کی طرح اس سال بھی ماہین اپنی قابلیت کی وجہ سے سب اساتذہ کرام سے داد وصول کرنے لگی۔

''اُف اس سال بھی ماہین اول آ گئی.....ضرور نقل کر کے پرچہ دیتی ہے جبھی تو اول آتی ہے۔'' رامین نے منہ بنا کر سوچا۔ وہ پڑھائی میں اپنا دل نہ لگاتی تھی، بلکہ دوسروں سے حسد کرنا اس کی عادت تھی۔

چھٹی سے پہلے لائبریری میں رامین، ماہین کے پاس سے گزری تو ماہین اسے دیکھ کر خوش اخلاقی سے بولی: ''ارے رامین! آؤ آؤ، کوئی کام ہے کیا؟''

''ہاں ہاں تم تو ایسے ہی بولو گی خود اول جو آئی ہو۔'' رامین طنزیہ لہجے میں بولی اور چلی گئی۔

''میں نے کچھ کہا بھی نہیں!'' ماہین سوچتی رہ گئی۔

ایک دن ماہین، رامین کے گھر پہنچ گئی۔

''ماہین! تم اور میرے گھر پر کیسے؟'' رامین اچانک ماہین کو اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر حیران ہوگئی، کیوں کہ وہ نہ اس کی سہیلی تھی اور نہ کبھی اس کے گھر پر آئی تھی۔ ''ہاں وہ بس ضروری کام تھا۔'' ماہین نے مسکرا کر کہا اور اندر داخل ہوگئی۔ رسماً گفتگو کے بعد ماہین نے رامین کو اپنے آنے کی وجہ بتائی: ''رامین! میں جانتی ہوں کہ تم ذہین ہو، مگر بس تم میں ہمت کی کمی ہے، اگر تم غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو تو میری طرح اول آ سکتی ہو۔ بس تم میری طرف سے اپنا دل صاف کر لو۔''

رامین حیران و پریشان یہ سوچ رہی تھی کہ جس لڑکی سے وہ نفرت اور حسد کرتی ہے، وہی اس کی بھلائی کا سوچ رہی ہے۔ ماہین نے اس دن کے بعد سے رامین کے ساتھ مل کر پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دونوں میں دونوں پکی سہیلیاں بن گئیں اور اگلے سال دونوں خوشی خوشی اپنے اول آنے کی مبارک باد وصول کر رہی تھیں۔

دودھ کا دودھ، پانی کا پانی

محمد شایان زاہد، کراچی

ملک یمن پر ملکہ افروز کی حکمرانی تھی۔ ملکہ اللہ سے ڈرنے والی اور عبادت گزار تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ملک میں سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جاتا اور کوئی شخص اپنے عہدے یا رتبے کی وجہ سے بڑا نہیں تھا۔

ایک بار ملکہ افروز کا ایک بہت ہی قیمتی ہار چوری ہوگیا۔ ملکہ نے کسی پر الزام لگانے کے بجائے یہ اعلان کردیا کہ آج شام دربار کے سب وزیر، درباری اور تمام خدمت گار دربار ہال میں جمع ہوجائیں۔ ہار کا اپنے آپ پتا چل جائے گا۔

وزیر کو بڑا تعجب ہوا کہ آخر ملکہ کس طرح ہار کا پتا چلائے گی۔ شام کے وقت سب لوگ ہال میں جمع ہوگئے۔ ملکہ نے کپڑے سے بنے ہوئے خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: سب لوگ اس خیمے میں جاکر اندر لگے بانس کو چھوئیں گے جس نے بھی ہار چرایا ہوگا اس کا ہاتھ اس بانس سے چپک جائے گا۔ کوشش کے باوجود بھی اپنے ہاتھ کو نہیں چھڑا پائے گا۔''

باری باری سب نے بانس کو چھوا اور باہر آگئے، مگر بانس پر کسی کا بھی ہاتھ نہیں چپکا۔ اب ملکہ نے اپنے ایک خاص وزیر کو اشارہ کیا اور وہ ملکہ کا اشارہ ملتے ہی سب کے ہاتھ سونگھنے لگا۔ اچانک اس نے ایک وزیر کو ملکہ کے آگے لاکھڑا کیا۔

''بتاؤ وہ ہار کہاں ہے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''کون سا ہار؟'' وزیر نے چہرے پر حیرانگی لاتے ہوئے پوچھا۔

''وہی ہار جو تم نے چرایا ہے، کیوں کہ تمھارے ہاتھ میں وہ مخصوص خوشبو نہیں آرہی جو اس بانس پر میں نے لگوائی تھی، تاکہ سچ اور جھوٹ کا پتا چل جائے۔ تم نے خیمے میں جاکر ڈر کے مارے کہ کہیں تمھارا ہاتھ بانس پر نہ چپک جائے۔ بانس کو ہاتھ نہیں لگایا اور اس طرح تمھارے ہاتھ میں وہ مخصوص خوشبو نہیں آرہی تھی جو میں نے بانس پر لگوائی تھی۔'' ملکہ نے کہا۔

وزیر کو وہ ہار واپس کرنا پڑا۔ ملکہ کی عقل اور انصاف پسندی کی دیگر سب ہی وزیروں نے تعریف کی۔

پانی نعمت ہے
نعمت کی قدر کیجیے

پانی زندگی ہے ... زندگی کو اہم جانیے

پانی ضائع نہ کیجیے

پانی کے حصول ، حفاظت اور ذخائر کو اپنی قومی سوچ کا حصہ بنائیے

اشاعت سے معذرت

درجِ ذیل نونہالوں کو لکھنے کی مزید مشق کرنی چاہیے۔ بعض نونہال اپنا پورا پتا نہیں لکھتے، بعض تو اپنا نام تک نہیں لکھتے۔ ای-میل سے بھیجی گئی تحریریں ان پیج میں، بڑے فونٹ میں بھیجیں اور ان کے ساتھ ڈاک کا پتا ضروری ہے۔ بعض نونہالوں نے بہت باریک اور سطر چھوڑے بغیر کاغذ کے دونوں طرف لکھ دیا ہے۔ بعض نونہال کسی دوسرے کی تحریر نقل کر کے اپنے نام سے بھیج دیتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ اس مرتبہ سے ہم صرف عنوان تحریر کیا کریں گے، تاکہ جس کی تحریر ہو، صرف اسی کو معلوم ہو۔

کراچی: ایک گھر کا منظر۔ ذہنی آزمائش۔ دولت مند۔ مجاہد۔ زندگی کا مقصد۔ پیلا رنگ۔ پکنک۔ مانو کہنا۔ بلاعنوان کہانی۔ عقل مند شکاری۔ سید زادی۔ اصل مزہ۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اتفاق میں برکت۔ عیب نکالنا آسان۔ لالچ بُری بلا ہے۔ جلد بازی کا انجام۔ اللہ پر بھروسا۔ بہنوں کا راز۔ فریم۔ لال ساڑھی والی۔ پپی برتھ ڈے۔ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ سال گرہ مبارک۔ نیا گھر۔ شیطان اور اس کے چیلے کی خفیہ ملاقات۔ اُف یہ بچے۔ پہیلیاں۔ ☆ **خیر پور میرس:** جنوں اور انسانوں کی جنگ۔ دادی جان کے خواب کی تعبیر۔ پیارا پاکستان۔ پرانی حویلی۔ سلیم اور جن۔ نپولین، آئن اسٹائن..... جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ دوستی ہو تو ایسی۔ آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔ ایڈونچر وبک۔ اچھا وفادار ☆ **میر پور خاص:** خود فیصلہ نہ کرو ☆ **حیدر آباد:** استاد محترم۔ نیکی کا بدلہ ☆ **ساہیوال:** فریج کا بھوت ☆ **تلوٹڈی:** کرو مہربانی تم اہلِ زمین پر ☆ **کوٹ چھٹہ:** بابو سر ٹاپ ☆ **ٹیکسلا:** بسم اللہ کی برکت۔ احسان۔ صفائی ☆ **کھپرو:** صبر کا پھل۔ درخت اور لکڑ ہارا۔ رزق کی قدر ☆ **کوٹ ادو:** احساسِ ندامت۔ بہادر لڑکا ☆ **لاہور:** نافرمان بچے کا خواب ☆ **خانپور:** پچھتاوا ☆ **ڈیرہ اسماعیل خان:** بندر یا شہزادی ☆ **بورے والا:** اللہ کا حکم ☆ **راولپنڈی:** آزادی کی نعمت ☆ **اسلام آباد:** میری ڈائری کا ایک ورق ☆ **اٹک:** زیرو واٹ کا بلب ☆ **حاصل پور:** ظالم کا بُرا انجام ☆ **واہ کینٹ:** مشکل کا حل ☆ **جہلم:** ہیلمٹ کا استعمال ☆ **چکوال:** سچی توبہ ☆ **بہاول پور:** تعلیم و تربیت ☆ **نام پتا نامعلوم:** نافرمانی کا انجام۔ سچ کی برکت۔ اپنے حصے کی شمع ہی جلاتے جایئے۔ بوٹی چور کون؟۔ سبق۔ نافرمانی کی سزا۔ آم اور ہم۔ علم کی طاقت۔ جذبہ ختم نبوت۔ کھیت اور تعلیم

☆ **نظمیں: کراچی:** محنت۔ گرمی۔ نعتِ شریف۔ بلاعنوان ☆ **میر پور خاص:** جاوید کے نام ☆ **حیدر آباد:** بھوک۔ شیر ☆ **آزاد کشمیر:** میری بیماری۔ باغ کی سیر۔ میرا رزلٹ۔ محنت کرنا دن رات بچو! ☆ **احمد پور شرقیہ:** سیاست دان ☆ **اسلام آباد:** آؤ سب مل کر اس کو شجر بنائیں۔ اک وعدہ تھا میرا اس پرچم سے۔

آدھی ملاقات

شامل اشاعت بیشتر خطوط ہمدرد نونہال اگست ۲۰۱۹ء سے متعلق ہیں

نظموں میں ''ہمدرد نونہال'' پسند آئی۔ روشن خیالات میں حضرت علیؓ، ہنری فورڈ، شہید حکیم محمد سعید کے اقوال پسند آئے۔ لطائف سارے اچھے تھے۔ قدسیہ جبین کی نظم گرمی کی چھٹیاں اچھی تھی، بہت مزا آیا۔ ''شکا گو، میرا اگلا پڑاؤ'' سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ باقی کہانیوں میں سب اچھی تھیں۔ آدھی ملاقات میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بلی کا بچہ یہ نظم میں نے پہلے ایک رسالے میں پڑھی تھی، لیکن بہت اچھی ہے۔ نونہال مصور نے ہی مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے۔ حمنیٰ محمد عقیل، مصباح آصف، محمد سعد اللہ کی ڈرائنگ زیادہ پسند آئی۔ لفظ متحیر اور ٹھٹھک کے معنی کیا ہیں، ان کی وضاحت کردیں۔

دعا مصطفیٰ، خیرپور میرس

متحیر ایک صفت ہے، جو عربی سے اردو میں آئی ہے۔ اس کا مطلب حیرت زدہ، حیران، متعجب، ہکا بکا ہے۔ دوسرا لفظ ٹھٹھک نہیں ٹھٹک ہے۔ اسی سے لفظ ٹھٹکنا بنا ہے یعنی چلتے چلتے اچانک رک جانا۔ حیرت یا خوف کی وجہ سے ٹھہر جانا۔

سرورق پر ایک بچہ پاکستان کو سلام کر رہا ہے۔ جاگو جگاؤ میں حکیم سعید نے آزادی کا مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ کہانی تحفہ اس بار سب کہانیوں پر بازی لے گئی۔ نولکھا اور بلاعنوان انعامی کہانی بھی بہت پسند آئی۔ حرِ اسود معلوماتی مضمون تھا۔ شین شرارت اور نونہال مشاعرہ جیسے نئے سلسلے بہت پسند آرہے ہیں۔ اس بار تمام نظمیں بہترین تھیں۔ نونہال مصور میں مصباح اور زینب کی تصویریں اچھی لگیں باقی پورا شمارہ زبردست تھا۔

محمد احمد اسلم، کراچی

اس ماہ کا شمارہ بھی ہر شمارے کی طرح بہترین تھا۔ کہانیوں میں ڈاکو پکڑے گئے زبردست تھی۔ بلاعنوان کہانی درسی کتاب میں ہے۔ انکل! میں نے کہانی بھیجی تھی ''چور پکڑے گئے'' براہ مہربانی بتادیں وہ کیوں شائع نہیں ہوئی، کیوں کہ میرا نام ناقابلِ اشاعت میں بھی نہیں تھا۔

سیدہ زینب علی، نارتھ کراچی

ان شاءاللہ آیندہ شمارے میں شائع ہوئی۔

اگست کا شمارہ گھر میں سب کو بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی ''میری کہانی (شکیل صدیقی) تھی، جو لطیفے سے کم نہیں تھی۔ بلاعنوان انعامی کہانی سے سبق حاصل ہوا۔تحفہ کہانی بھی اچھی لگی۔ مجھے منزل پاکستان (تصویری کہانی) ایسی چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اس دفعہ کچھ لطیفے پرانے تھے۔ نونہال ادیب میں بندر کی شرارت، شکایت اور نونہال مصور کی تصاویر اپنی جگہ بہت جگ مگ کر رہی تھیں۔ سرورق بھی اچھا تھا۔ پورا رسالہ اچھا لگا۔ یہ بتائیں میں نے اگست کے شمارے کے لیے اتنی بڑی آدھی ملاقات لکھی، لیکن وہ اتنی چھوٹی کیسے ہوگئی؟

فاطمہ ناہید کراچی

رسالے پر رائے سے متعلق جتنی تحریر ہوتی ہے۔ صرف وہی لی جاتی ہے اس بار آپ کا پورا خط شامل کیا جارہا ہے۔

ہمدرد جیسے عظیم رسالے میں پہلی بار شرکت کرنے پر مجھے بے حد مسرت ہورہی ہے۔ ہمدرد نونہال ایک بہترین رسالہ ہے۔اس میں ہمیں دل چسپ کہانیاں، معلوماتی مضامین اور مزاح وتفریحی سے بھرپور تراشے ملتے ہیں، جن کا مطالعہ کرنے سے ہماری معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ ہماری اخلاقی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔

سیف اللہ پشاوری

اگست کا شمارہ اچھا لگا۔رسالے میں کچھ تبدیلیاں اچھی لگ رہی ہیں اور کچھ نہیں۔ رسالے کے آغاز میں ''ابھی تو چلنا سیکھ رہا ہوں''، نظم اچھی لگی۔تحفہ، سبق آموز رہی۔نولکھا میں اشرف کی ایمان داری نے دل جیت لیا۔گیدڑ بھبکی کا انجام زبردست تھا۔ بلاعنوان کہانی بھی ٹھیک تھی۔ مشکل وقت میں دوست ہی کام آتے ہیں۔سب سے اچھی کہانی ''میری کہانی'' پڑھتے ہوئے مجھے اپنا بچپن یاد آنے لگا، کیوں کہ میری اردو کم زور ہے۔شین شرارت کے لطیفے کچھ خاص نہیں تھے۔ سفرنامہ امریکا..... شکاگو مجھے پسند آیا۔ مجھے تو ویسے بھی دنیا گھومنے کا شوق ہے۔باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح معلومات سے بھرپور تھے، بہت پسند آئے۔

نونہال لغت

رن	ر ن	جنگ۔ لڑائی۔ معرکہ۔ میدانِ جنگ۔ رزم گاہ۔
طنطنہ	ط ن ط ن ہ	غرور۔ گھمنڈ۔ شان و شوکت۔ غصہ۔ بدمزاجی۔ باجے وغیرہ کی آواز۔
زمرہ	ز م رہ	جماعت۔ گروہ۔ جتھا۔ ساتھی۔ ہمراہ۔ بھیڑ۔ فوج۔
سپاٹ	س پا ٹ	ہموار۔ برابر۔ صاف۔ سادہ۔ جس کے کنارے یا اونچے نیچے نہ ہوں۔ [illegible]
اوسان	ا و سا ن	ہوش و حواس۔ ہمت۔ جرأت۔ حوصلہ۔
ایندھن	ا ی ن د ھ ن	جلانے کی چیزیں۔ لکڑی، کوئلہ وغیرہ۔
گھمسان	گھ م سا ن	لڑائی۔ جنگ۔ تباہی۔ بربادی۔ کثرت۔ [illegible]

سامع	سا م ع	سننے والا۔ سماعت کرنے والا۔
بوجھل	ب و جھ ل	وزنی۔ بھاری۔ لدا ہوا۔ بوجھ کے نیچے دبا ہوا۔
کایا	کا یا	جسم۔ شکل۔ صورت۔ ماہیت۔
پنہاں	پ ن ہا ں	چھپا ہوا۔ پوشیدہ
حواس	ح وا س	ہوش۔ عقل۔ سمجھ
رعشہ	ر ع ش ہ	کپکپی۔ تھرتھراہٹ۔ ایک بیماری کا نام، جس میں بدن کانپتا ہے۔
تلخ	ت ل خ	کڑوا۔ بدمزہ۔ بدذائقہ۔ ناگوار۔ ناپسند۔

ٹھاٹھ	ٹھا ٹھْ	شان و شوکت۔ آن بان۔ کروفر۔ دبدبہ۔ رعب۔
سپاس نامہ	سِ پا سْ نا مہ	کسی کی خدمت کے اعتراف و تشکر میں پیش کی جانے والی تحریر۔
ہونہار	ہوْ ن ہا ر	وہ جس میں لیاقت اور قابلیت کے آثار پائے جائیں۔
تندہی	تَ نْ دَ ہِی	کوشش۔ محنت۔ لگن۔
منفرد	مُ نْ فَ رِ د	اکیلا۔ تنہا۔ یکتا۔ یگانہ۔ واحد۔
وظیفہ	وَ ظِ یْ فہ	روزینہ۔ وہ رقم جو کسی ضرورت مند کو پابندی سے دی جائے۔ پینشن۔
ثقافت	ثِ قا فَ ت	تہذیب۔ طرزِ تمدن۔ انگریزی لفظ Culture کا ترجمہ۔
لاری	لا رِ ی	Lorry، ایک قسم کی موٹر گاڑی۔
تذبذب	تَ ذَ بْ ذُ ب	شک و شبہ۔ ہچکچاہٹ۔ پریشانی۔
استحکام	اِ سْ تِ حْ کا م	مضبوطی۔ پختگی۔ استقلال۔
کھلبلی	کھَ لْ بَ لِی	ہل چل۔ ہنگامہ۔ اضطراب۔ بے قراری۔
ابتر	اَ بْ تَ ر	بے قاعدہ۔ بے ترتیب۔ بے ربط۔ بری حالت۔
برتر	بَ رْ تَ ر	زیادہ بلند۔ ترجیح رکھنے والا۔ اعلا۔ غالب۔
رسوا	رُ سْ وَ ا	ذلیل۔ خوار۔ بدنام۔ بے عزت۔ رُوسیاہ۔
تابڑتوڑ	تا بَ ڑْ تو ڑ	متواتر۔ لگاتار۔ پے در پے۔ پیہم۔
حاوی	حا وِ ی	احاطہ کرنے والا۔ گھیرنے والا۔ چھا جانے والا۔ غالب۔ ماہر۔ کامل۔
رواں	رَ وَ ا ں	بہتا ہوا۔ جاری۔ چلنے والا۔ منجھا ہوا۔ صاف۔
افسردہ	اَ فْ سُ رْ دَ ہ	اداس۔ رنجیدہ۔ مرجھایا ہوا۔ پژمردہ۔